بسم الله الرحمن الرحيم

وَالَّذِینَ جَاهَدُوا فِینَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

مِنْهَاجُ الْقُرْآن

البرهان علی سبیل الرشاد والایقان

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ)

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332، 37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

کتاب	....	منہاج القرآن
ناشر	....	مسعود مفتی
سن اشاعت	....	
قیمت	....	-/400 روپے

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط ﴿المائدہ ۵:۴۸﴾

اِنتساب

مہبطِ وحی

نمونۂ کمال

پیغمبرِ انقلاب

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ ﷺ

کے نام

ترتیب

ہر مصنف کا میلان یہ سوچنے کی طرف ہوتا ہے کہ اس کا فکر خارج اور باطن کے مطالبات کا جواب ہے۔ یہی میلان میرا بھی ہے۔ اس وقت پورا عالم اس جاہلیت سے بھی زیادہ تیرہ و تاریک تر جاہلیت میں گرفتار ہے جس سے نکالنے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا تھا۔

دورِ جدید کی جاہلیت قرآن کے حُجَّةٌ مِّنْ م بَعْدِالرُّسُل ہونے کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے اور ہماری دینی حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ دورِ جدید کی جاہلیت کے چیلنج کو قبول کرکے اس کی اصلاح کے لئے بھی قرآن ہی سے رہنمائی طلب کریں۔

یہ ذمہ داری مطالعہ قرآن کے ایک ایسے منہاج کی متقاضی ہے جس سے قرآنی نمونہ علم میں یکسانی پیدا ہوسکے اور قرآن مجید کے عطا کردہ علم میں اشتراک میسر آسکے۔ منہاج مسائل کے حل کرنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ منہاج کے دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی اصول اور دوسرا اس اصول کی روشنی میں مسئلے کو حل کرنے کا عمل (Procedure) ان دونوں اعتبارات سے منہاج القرآن کو فکر و فلسفہ کے ان تمام منہاجات سے متمیز کرکے سمجھنا ضروری ہے جن کے بے نتیجہ ہونے کے باعث اس منہاج کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جس صورت حال کے پیش نظر مطالعہ قرآن کے منہاج کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی وضاحت "تمہید" کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ مذہبی ذہن جن مراحل سے گزر کر اس حال کو پہنچا ہے اس کی نشاندہی بھی اس لئے ضروری تھی کہ

موجودہ حالات میں متداول دینی علوم اور مروجہ دینی نظام تعلیم اور اس سے پیدا ہونے والا مذہبی فکر ان مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے جن کے حل پر ہماری اصلاح منحصر ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دورِ مابعد رسالت میں حجیت قرآن ان نتائج کے پیدا ہونے کے ساتھ مشروط ہے جو دورِ رسالت میں پیدا ہوئے تھے اور اب جن کے اعادے کے بارے میں مذہبی ذہن اس لئے متزلزل ہو گیا ہے کہ وہ دورِ رسالت میں برپا کئے جانے والے انقلاب کو کتاب و سنت کی پیروی سے وابستہ کرنے کے بجائے صرف پیغمبرانہ قیادت کی معجزہ کاری سمجھتا ہے اور "ختم نبوت" کے بعد کتاب و سنت کی نتیجہ خیزی کے بارے میں منفی ذہن اس لئے اختیار کئے ہوئے ہے کہ یہ اُن شرائط کی جستجو نہیں کرتا جن کی بنیاد پر حتمی نتائج کے پیدا ہونے کی ضمانت قرآن مجید کے دورِ مابعد رسالت میں حجتہ ہونے کی بنیاد پر میسر آتی ہے۔ اس صورت حال سے نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ قرآن کو صحیفہ انقلاب سمجھ کر اس سے انقلابی جدوجہد میں اسی ہدایت کی تمنا کی جاتی جو قرآن نے پیغمبر انقلاب کو فراہم کی تھی۔ لیکن یہ تمنا اس لئے نہ کی جا سکی کہ قرآن کو صحف ماسبق پر قیاس کر کے اس سے بھی صرف وہی آرزو کی گئی جو صحف ماسبق سے کی جا سکتی تھی کہ امم سابقہ میں کوئی اُمت محض اپنے صحیفہ کے سہارے نئی بعثت کے بغیر زوال سے نہ نکل سکی حالانکہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کا دعویٰ یہ اعتماد دلا رہا ہے۔ مگر وہ اعتماد فقط اس وجہ سے ضائع ہو گیا کہ ہم نے سورہ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کے اس محتوی (Content) کو پیش نظر نہیں رکھا کہ وہ مقصودِ بعثت کو ہی پانے کی صراط مستقیم ہو سکتی ہے کہ (بفضل الٰہی و بسیلِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماضی، حال اور مستقبل میں یہ دعا مانگنے والے محمد رسول اللہ کے

ساتھ اس دعا میں برابر کے شریک ہیں۔

چونکہ قرآنی علم' غایت اور اس کے حصول کے ضامن لائحہ عمل کا علم ہے اس لئے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا میں مضمر نصب العین (جو مقصودِ بعثت کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا) حاصل کیسے ہو؟

لیکن انسانی استعداد کا زائیدہ علم "ماہیت کا علم" ہے جو علم الغایات سے اپنی نوعیت میں مختلف ہے لہٰذا جب علم بالوحی انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھلا تو وہ تفسیر' تعبیر' تاویل' توجیہ و تعلیل کا علم بن کر رہ گیا۔

اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ قرآن کا مسئلہ تو یہ تھا کہ جس نمونے پر حیات انسانی کو ڈھلنا چاہیے وہ ڈھلے کیسے؟

جبکہ مفسر کا مسئلہ یہ تھا کہ قرآن کیا ہے؟ جب "کتاب" کا مفہوم لغت کے حوالے سے متعین کیا گیا تو قرآن اوامر و نواہی کا ضابطہ ہی متصور ہو سکا اور جب تک قانون قوت نافذہ سے محروم نہیں ہو گیا۔ اسلامی اقدار کی حفاظت اور زندگی کے تقاضوں کی تکمیل اوامر و نواہی کے ضابطہ سے انحراف کے بغیر ہوتی رہی مگر جب موثرات زندگی بدل گئے تو زندگی کے تقاضے قانون کی خلاف ورزی کے بغیر پورے نہ ہو سکے اور قانون اقدارِ حیات کی حفاظت نہ کر سکا تو زندگی جمود کا شکار ہو گئی جسے توڑنے کے لئے انحراف کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

. زندگی کے انفرادی پہلو میں بے مقصدی' بے یقینی اور بے انضباطی غالب آگئی اور اجتماعی پہلو کے معاشرتی پہلو میں اخوت کی جگہ خودپسندی اور نسلی تفاخر اور معاشی پہلو میں انفاق' ایثار و احسان کی جگہ حرص' لالچ اور بخل نے لے لی اور سیاسی پہلو میں کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے تحت منزل من اللہ احکام کے مطاع اور مطیعوں کے لئے یکساں واجب التعمیل ہونے کے بجائے ہوس اقتدار غالب آگئی اور

بین الاقوامی پہلو میں زندگی غلبہ دین حق سے محروم ہو کر عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ و رجنگ کا مظہر بن گئی۔ نتیجۃً غلبہ باطل مسلط ہو گیا۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی ذہن اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہو گیا۔ اندریں صورت یہ سوال پیدا ہوا کہ:

"قرآن میں، جس کی حیثیت "حجتہ من بعد الرسل" کی ہے، دورِ مابعد رسالت میں اُمت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد دوبارہ عروج حاصل کرنے کی کوئی ضمانت ہے؟"

دینی اور لادینی علوم متداولہ کا روایتی انداز اس مسئلے کو حل کرنے میں رکاوٹ بنا رہا۔ اس رکاوٹ نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ مطالعہ قرآن کا کوئی ایسا منہاج متصور ہو سکتا ہے جو غایت نزول قرآن کے حاصل ہو کر رہنے کی ضمانت رکھتا ہو۔

راقم الحروف نے اپنی طالب علمی کے تقاضے کے تحت اس سوال پر غور کیا جس کے نتائج اصحابِ علم کی خدمت میں پیش کر کے بھجوائے۔

وَلِلْاَرْضِ مِنْ كَاسِ الْكِرَامِ نَصِيْبٌ۔

ہر مکتبہ فکر کے علمائے کرام کے گوشہ چشم التفات کا آرزومند ہے۔

برہان احمد فاروقی

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ ﴿محمد:۲۴﴾

تمہید

قیام پاکستان کے باوجود ہماری زندگی اخلاقی' معاشرتی' معاشی' سیاسی اور تعلیمی پہلوؤں میں اسلامی نمونے پر نہ ڈھل سکی۔ اس کے اسباب کیا ہیں اور ان کا تدارک کیسے ہوگا؟

اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ:

بے یقینی عام ہے۔

قول و عمل میں تضاد ہے۔

طبقاتی کش مکش ہے۔

علاقائی عصبیتیں ہیں۔

چوری ہے' ڈاکا ہے' اغوا ہے۔

ظلم ہے' بھوک ہے۔

لاقانونیت ہے' تشدد ہے۔

نیکی پامال ہے' بدی غالب ہے۔

وعظ بے اثر ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ ہم ان آزاروں کے علاج کی آرزو سے بھی محروم ہیں کیونکہ ہم اصلاح کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین سے بھی عاری ہیں۔ یہ سب کچھ بے مقصدی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے بے راہ روی ہے۔

بے یقینی کیوں ہے؟

مقصد نہ ہو تو یقین کی حاجت نہیں رہتی اور مقصد نہ ہو تو عمل کا رخ متعین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بے راہ روی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ قول و عمل کا تضاد بھی سی لئے ہے کہ جس چیز کا دعویٰ کیا جا رہا ہے' موقع پرستی اور مفاد پرستی کے ماحول میں اس کے خلاف عمل کئے بغیر کوئی تقاضا پورا نہیں ہو سکتا۔ فرد کے سامنے کوئی حیات بخش مقصود نہ رہے تو پہلے وہ نشاط کاری' پھر لذت اندوزی' پھر ہوس انگیزی اور پھر معصیت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تمام جرائم اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب حیات اجتماعی کا کوئی مقصود نہ رہے تو موت وارد ہو جاتی ہے کیونکہ اجتماعی موت' جو عدم اور وجود کو برابر کر دیتی ہے' عبارت ہے غایت کی بصیرت کے خیرہ ہو جانے' نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے' تصورِ کائنات کے بے معنی ہو جانے اور فضائل اخلاق کے مسخ ہو جانے سے۔ ایک لفظ میں بیان کریں تو اسی کا نام "بے مقصدی" ہے۔

آج نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ اقدار بدل گئی ہیں' حالانکہ اقدار بدلتی نہیں ہیں۔ اقدار دو قسم کی ہیں:

ایک وہ جو بالذات مقصود ہیں اور یہ کبھی نہیں بدلتیں۔

دوسری وہ جن کی حیثیت ذریعے کی ہے اور وہ کسی مقصود کی وجہ سے قیمت پاتی ہیں۔

مگر جب سیرت میں زوال آ جائے تو اقدارِ کاملہ مفاد پرستی کے تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور اقدارِ عالیہ کو مفاد پرستی کا ذریعہ بنانے والے اپنی بے کرداری پر پردہ ڈالنے کے لئے نعرہ لگاتے ہیں کہ اقدار بدل گئی ہیں۔

ہم نے بے یقینی کی وجہ سے سوچنا بھی یہ سمجھ کر چھوڑ دیا ہے کہ جب

ہمارے کئے سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا تو سوچنے سے کیا حاصل؟ اس طرز عمل نے ہمیں جانوروں کی سطح تک گرا دیا کیونکہ انسان اور حیوان کی زندگی میں فرق صرف احساس ذمہ داری اور خود شعوری کا ہے۔

یہ فکر و عمل کا وہی تضاد ہے جس کی بنا پر فرائض کے حوالے کے بغیر حقوق کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ طبقاتی کش مکش جسے ہم دوسروں کے ایما پر نمایاں کرتے ہیں سرمایہ دار اور مزدور' زمیندار اور کاشت کار' افسر اور ماتحت' استاد اور شاگرد کے درمیان نہیں ہے' نہ یہ طبقات ہیں۔ اگر سرمایہ دار طبقہ ہوتے تو ایک سرمایہ دار دوسرے کو تباہ کرنے کی سازش نہ کرتا۔ اگر مزدور طبقہ ہوتے تو ایک مزدور دوسرے مزدور کو قتل نہ کرتا۔ اگر زمیندار طبقہ ہوتے تو ایک زمیندار دوسرے زمیندار کے کھلیانوں میں آگ نہ لگواتا۔ اگر کاشت کار طبقہ ہوتے تو ایک کاشت کار' نالی کا پانی کاٹنے پر دوسرے کاشت کار کا گلا نہ کاٹتا۔ اگر افسر' طبقہ ہوتے تو ایک افسر دوسرے افسر کے خلاف سازش کا جال نہ پھیلاتا۔ اگر ماتحت طبقہ ہوتے تو ایک ماتحت دوسرے کا بدخواہ نہ ہوتا۔ استاد طبقہ ہوتے تو آپس میں عداوت نہ رکھتے۔ طلبہ ایک طبقہ ہوتے تو باہم دست و گریباں نہ رہتے۔

طبقات کی یہ تقسیم ہی غلط ہے کیونکہ ان تمام نام نہاد طبقات میں سے ہر گروہ میں سلامتی کے طلب گار بھی موجود ہیں۔ اور جرائم پرور اور جرائم نواز بھی۔ طبقات اگر ہیں تو ظالموں' فاسقوں' غاصبوں' مجرموں' منافقوں اور مجرم نوازوں کے ہیں۔ کوئی جرائم پیشہ اپنے ہم پیشہ کے خلاف جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ کوئی چور کسی چور کے گھر چوری نہیں کرتا۔ کوئی رسا گیر کے مویشی نہیں لے جاتا۔ کوئی ظالم کسی ظالم کے خلاف ثبوت جرم فراہم نہیں کرتا۔ کوئی قانون شکن کسی قانون پسند کا دوست نہیں ہوتا۔ غرض کوئی بدکار آدمی سفلہ نوازی اور سفلہ پروری کے بغیر اپنی

مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ سلامتی کے طلب گار اس لئے خوار ہیں کہ وہ اپنی نیکوکاری کی حفاظت میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ بدی اس لئے غالب ہے کہ منظم ہے۔ نیکی اس لئے مغلوب ہے کہ غیر منظم ہے۔ وعظ اس لئے بے اثر ہے کہ اس کے پیچھے نہ یقین ہے نہ بصیرت نہ طاقت۔

ہم جن لوگوں کی بدولت اس حال کو پہنچے ہیں وہ ہمارے معاشرے میں سفید پوشانہ جرائم پیشگی میں باکمال جاہ پسندوں کا وہ گروہ ہے جو ہر جگہ مقبول ہے۔ سفیہانہ پست سیرتی اور سطحی ذہانت کے امتزاج سے اپنی اجارہ داریاں قائم کرنے کے لئے ہر فضیلت کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور جلب زر کی مسابقت میں ہر حد پھلانگ چکا ہے۔ وہ جس کام کو خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اس کے وسائل پر تصرف حاصل کر کے اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اس کا آغاز ہی نہ ہونے دے۔ وہ اگر کسی کی اہلیت کو اپنی اجارہ داری کے لئے خطرہ تصور کرتا ہے تو اس کی دشمنی میں ان کافروں سے بھی بازی لے جاتا ہے جنہیں قرآن نے الدالخصام (دشمنی میں شدید ترین) کے لقب سے یاد کیا ہے۔ نیکی اور نیک کرداری کے کسی دعویدار سے اس گروہ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کوتاہی کسی مقام پر کبھی دیکھنے میں نہیں آتی۔

نظام تعلیم

مروجہ نظام تعلیم ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے اور رکھنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ جو لوگ اس سانچے میں ڈھل کر اور غیر ملکی اختیار سے سازگاری کے بدلے میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں وہ اس میں کسی تبدیلی کے روادار کیونکر ہو سکتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ

ہمارے ذرائع ابلاغ اکثر و بیشتر نشاط کاری' لذت اندوزی' ہوس انگیزی اور

معصیت کوشی کے پروگراموں کی تبلیغ کرتے ہیں۔

انتظامیہ

انتظامیہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایتائے حقوق کا نظام ہے۔ مگر عملاً انتظامیہ کے جس وظیفے کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ اس طاقت کے اظہار کا ذریعہ ہے کہ ہم حقوق سے محروم کر دینے پر قادر ہیں۔

نظام عدل

جب تک کلمہ طیبہ کی بنیاد پر وہ معاہدۂ عمرانی وجود میں نہ لایا جائے جس میں مطاع اور مطیع دونوں منزل من اللہ قانون کے تابع ہوں' ایسا ہی نظام عدل پیدا ہوگا جس سے جرائم بلا روک ٹوک پھلتے پھولتے رہیں گے۔

اخلاقی قدروں کا فقدان

اگر ایسے احوال پیدا ہو جائیں (جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکے ہیں) کہ زندگی کا ہر تقاضا اخلاقی حدوں کی خلاف ورزی ہی سے پورا ہوتا ہو اور معاشرے میں بدی کے ہاتھوں نیکی پامال ہو رہی ہو تو اخلاقی قدریں برقرار نہیں رکھی جاسکتیں۔ نظم وضبط تو رضائے الٰہی کے حصول کو نصب العین بنا کر اس کے لئے جدوجہد کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے اندر خدا پر یقین ہی باقی نہیں رہا جس کی شہادت یہ ہے کہ جبلی داعیات ایمان باللہ پر اور طبعی خواہشات اس تاریخی تجربہ پر غالب ہیں کہ ماضی میں کامیابی ضبط و انقیاد سے حاصل ہوئی تھی اور نفسانی تقاضے اس شعوری تقاضے پر حاوی ہیں کہ ہر کامیابی کی لئے فضائل اخلاقی ضروری ہیں۔ اس سے تو ایمان باللہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ نظم وضبط کیا چیز ہے۔

ہماری اپنی زندگی کے اخلاقی' مذہبی' معاشرتی' معاشی' سیاسی اور تعلیمی پہلوؤں

کے اسلامی نمونے پر ڈھلنے میں کیا موانع ہیں اور انہیں کیسے دُور کیا جا سکتا ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جو حل ہونا چاہیے مگر اس لئے حل نہیں ہو رہا کہ ہم غیر جانبداری سے اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینا نہیں چاہتے۔ اس سوال کے سوا میں مجھے بات یہ اصرار ہے کہ اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ بے یقینی' بے اعتمادی اور قرآن سے مایوسی ہے۔

دراصل یقین اور بے یقینی دونوں تجربی توثیق و شہادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ فتح و کامرانی کا تجربہ یقین پیدا کرتا ہے اور شکست و ناکامی کے تجربے سے بے یقینی راسخ ہوتی ہے۔ جب سے ہم تاریخی کش مکش کے نتیجے میں ناکامی کے تجربات سے گزرے ہیں۔ یقین و اعتماد سے محروم ہوگئے ہیں اور جب ہم اپنے زوال' اپنی بے یقینی اور بے اعتمادی کا مداوا قرآن مجید سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم قرآن کی رہنمائی سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مطالعہ قرآن سے آرزو تو غلبہ حق کی پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ غلبہ باطل کا ہوتا ہے۔ اس سے ہماری بے یقینی اور بے اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے اور ہم قرآن سے بھی مایوسی میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ صرف عوام ہی نہیں بلکہ الاماشاء اللہ علماء اور صوفیہ بھی اس بے یقینی اور قرآن سے مایوسی میں مبتلا ہیں۔ علماء اور صوفیہ کے مایوسی میں مبتلا ہونے کی وجہ ان کے کچھ خودساختہ نظریات ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ "بے نیاز" ہے۔ جسے چاہتے غالب کردے جسے چاہے مغلوب۔ لیکن اللہ تعالیٰ بے نیاز ہو اور بندے مایوس ہوں تو عبودیت کی نسبت فنا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور عبودیت فنا ہو جائے تو یہ آرزو بھی باقی نہیں رہتی کہ

نومیدی میں کاش اے دل تیرے بھی خدا ہوتا

دراصل اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے اپنی ناکامیوں کی توجیہ ایک طرف' ناکامیوں کے اسباب کے غیرجانبدارانہ تجزیے سے گریز کا اور دوسری طرف اپنی بے یقینی کے تحت "صمدیت" کے مفہوم کو مسخ کرنے کا نتیجہ ہے۔

عقائد اور مذہبی رسوم و ظواہر کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے والوں کی شکست کے اسباب یہ ہیں:

- عقائد کا بے جان ہونا۔
- عبادات کا مردہ رسوم و ظواہر میں تبدیل ہو جانا۔
- فرقہ پرستانہ آرزوؤں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ راہ حق پرستی سمجھنا۔
- تخیل پرستی اور کمزوری کا شکار ہو کر باطنی طمانیت کی خاطر معاشی زندگی کو راہبانہ قناعت سے بسر کرنا۔
- منصوبہ بندی' مسابقت اور تصادم سے گریز کی بناء پر پہلے معاشی نشوونما دینے کی صلاحیت سے' پھر اس کی آرزو سے عاری ہو جانا۔
- دنیا میں مسلسل ناکامیوں سے مضمحل ہو کر قبل از مرگ زندگی کو قانون پروردگاری سے ناسازگار بناتے چلے جانا۔

بخلاف اس کے تقویٰ شکن قومیں زندہ مشاہداتی علوم کے (جو تسخیر ماحول میں مفید ہیں۔) حاصل کرنے' مقصد کے حوالے سے سیرت و کردار پیدا کرنے' کائناتی ادراک کو نمایاں کرنے کی آرزو کے تحت مقصد کے شعور کے ساتھ منصوبہ بندی' مسابقت اور کش مکش میں پڑنے' تصادم کے لئے آمادہ رہنے' حقیقت پرستی اور ماحول کو سازگارہ بنانے کے لئے کوشاں رہنے کی بناء پر عملی زندگی کو قانون

پروردگاری سے سازگار بناتی چلی گئیں۔

ہم زوال پذیر مطلق العنان ملوکیت کا بدل سیاست میں اور انحطاط آمادہ جاگیرداری نظام کا بدل معیشت میں پیدا نہ کرسکے تو برعظیم پاک و ہند میں ہمارا زوال ہوگیا۔ برطانوی استعمار ہمارے اوپر مسلط ہوگیا۔ چونکہ برطانوی استعمار نے اقتدار میں اپنا حریف مسلمانوں کو سمجھا تھا اس لئے انہوں نے سلطنت کے تمام وسائل مسلمانوں کے دل و ذہن سے اسلام کے قابل عمل ہونے کا اعتماد اٹھانے کے لئے استعمال کیئے۔ اس ضمن میں برطانوی استعمار نے ضبطی اوقاف کا قانون نافذ کرکے ہمارے تمام تعلیمی' تبلیغی' اسلامی اداروں کو مالیات سے محروم کردیا۔ شرعی عدالتوں کے ختم ہونے اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر لادینی نظام کے مستولی ہو جانے کا اثر یہ ہوا کہ علماء معاشی ابتلا کا شکار ہوگئے۔ اور معاشی انقلاب کی قیادت کی اہلیت سے محروم ہوگئے۔ نتیجۃً حیات عمرانی کی اساس فقہ کے بجائے وطن پرستی بن گئی۔

حیات عمرانی کے تمام تقاضے (معاشرتی' معاشی' سیاسی' ثقافتی' تعلیمی) لادینی نظام سے پورے ہونے لگے۔ مذہب انفرادی' نجی' ذاتی' شخصی' باطنی زندگی کا جزو بن گیا۔

عقیدہ وہم میں اور عبادات رسوم و ظواہر میں تبدیل ہو کر رہ گئیں۔

غایت کا تصور خیرہ ہو جانے اور نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے سے تنظیم کا شعور مٹ گیا۔

اباحتی معیشت نے ہر چیز کو خریدنی اور فروختنی جنس بنا دیا۔

کفر کا فتویٰ جو ایک زندہ نظام معاشرت سے اخراج کی سزا کی حیثیت رکھتا تھا' فرقہ پرستانہ اختلاف کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

علماء جو اپنے دورِ اقتدار میں قانون سازی ہی کے ذریعے مسائل حیات حل

کرتے چلے آ رہے تھے' اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود بغیر طاقت کی قانون سازی سے دستبردار نہ ہو سکے۔

تمدنی نظام کا عادی ذہن تاریخی انقلاب سے گزر کر لاقانونیت کی حمایت میں اپنے خلاف طاقت کا استعمال دیکھ کر مفلوج ہو گیا۔

زندگی کے ہر پہلو کی قیادت جدید تعلیم یافتہ ذہن کو منتقل ہو گئی۔

مسلم معاشرے میں شگاف پڑ گیا۔ ایک طرف مذہبی اور دوسری طرف جدید ذہن ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

مذہبی قیادتوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف حصول آزادی کی خاطر ہندو مسلم اختلافات سے اس درجہ بے نیازی اختیار کی کہ عمرانی وحدت کے شعور کی اساس وطن پرستی بن گئی۔

قرون اولیٰ میں پیدا ہونے والے نتائج کتاب و سنت کی پیروی کے بجائے پیغمبرانہ قیادت کے معجزات تصور ہونے لگے۔

قبل از مرگ زندگی میں قرآن کی رہنمائی کے نتائج سے مایوس ہو کر قرآنی تعلیم کے مطابق جدوجہد کے نتائج کا انحصار آخرت پر ہو گیا۔

اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قبل از مرگ زندگی کو ایک مشاہداتی حقیقت جان کر اس کی فلاح اور کامیابی کو نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے وابستہ کرنے اور حصول نصب العین کے لئے قبل از مرگ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کو ضروری سمجھنے کے بجائے یہ ذہنیت بنی کہ اپنی اور اللہ تعالیٰ کی کامیابی کو آخرت پر ملتوی کر دیا گیا۔

جدید ذہن نے دین کی تربیت مذہبی ذہن سے پائی تھی۔ اسی لئے جدید ذہن کو اس زندگی میں ترقی کرنے کے لئے جو رہنمائی درکار تھی اس کی توقعات' دین سے

منقطع کر لیں اور جدید افکار و نظریات سے مسائل حیات کو حل کرنے کا میلان پیدا کیا۔

انبیاء علیہم السلام اور اصلاح انسانیت

انبیاء علیہم السلام نے اصلاح انسانیت کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ:

> "اس کائنات میں اللہ تعالیٰ ہی کا ایک نظام' اسی کا قانون'
> اسی کی ذات متصرف ہے۔ اس کے مقابلے میں باطل کی کوئی
> حیثیت نہیں۔"

مگر اللہ تعالیٰ کی ذات نامشہود ہے۔ جب باطل کی طرف سے مزاحمت ہوتی ہے تو انسانی ذہن باطل کی (دوسری) طاقت کو مؤثر دیکھ کر مجبور ہو جاتا ہے کہ باطل کی طاقت کو اور اس کے مؤثر ہونے کو بھی تسلیم کرے۔ یہی شرک کی بنیاد ہے۔ پیغمبرانہ بعثت کا مقصد تخریبی طاقتوں کی گرفت سے انسانی فکر و عمل کو نجات دلانا تھا۔ اس کے بغیر انسانیت شرک سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔

پیغمبرانہ قیادت کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی نظام' ایک ہی قانون اور ایک ہی طاقت متصرف ہے اور وہ خدا کی طاقت ہے۔ جب پیغمبرانہ قیادت خدا کی ایک طاقت کا یقین دلانے کی سعی کرتی ہے تو عوامی سطح پر یہ یقین تب ہی راسخ ہو سکتا ہے جب پیغمبرانہ قیادت باطل کی طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کامیابی کی شرط یہ ہے کہ جو لوگ پیغمبرانہ قیادت کی پیروی کرتے ہیں ان کے ایمان کی آبیاری کی جائے۔ ایمان کی آبیاری اس پر منحصر ہے کہ اہل ایمان کی زندگی کے تمام تقاضے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کی پیروی ہی سے پورے ہوں اور انہیں ان

کی تکمیل کے لئے انحراف کی راہ نہ اختیار کرنی پڑے لیکن اس اسوۂ مبارک کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ اگر افراد اور معاشرہ اور ریاست اتباع ہی کی راہ سے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کا اہتمام کریں تو باطل کو شکست دی جا سکتی ہے۔

دینی فکر میں اختلال

نزول قرآن کی غایت کے باب میں مذہبی ذہن کا التباس بھی دینی فکر میں اختلال کا ایک اہم سبب ہے جس کے نتیجے میں دو موقف اختیار کئے جاتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ نزول قرآن کا مقصد صرف اخلاقی اصلاح کرنا ہے۔ یہ ہو جائے تو باقی نتائج ازخود پیدا ہو جائیں گے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ قرآن زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت دینے کے لئے نازل ہوا ہے۔

پہلے موقف کی رو سے دین کی ماہیت اصلی فضائل اخلاق متصور ہوتے ہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ اس موقف کا ایک نتیجہ تو "وحدت ادیان" ہے۔ دوسرا یہ کہ مذہب ایک بالذات فضیلت کی حیثیت سے مسلم نہیں رہتا اور تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ توحید کی حیثیت بھی فضائل اخلاق کے ایک ذریعہ کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر جب عقلی بنیاد پر اخلاق کو اس انداز سے سمجھا جائے کہ فرض کو فرض کی خاطر بجالانا اخلاق ہے تو بت پرستی اور انکارِ توحید سے بھی اس مذہب کے بیازگار ہونے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جس کی ماہیت اصلی فضائل اخلاق ہوں۔ غرض اس موقف نے ہمیں یہاں لاکر کھڑا کر دیا کہ

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
وقت ست دگر بتکدہ سازند حرم را

حالانکہ مذاہب میں فضائل اخلاق مشترک نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ہر مذہب کی رو سے راس الحسنات (ام الفضائل) کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندو مت کی رو سے راس الحسنات "عجز و انکسار" ہے۔ بدھ مت کی رو سے سب سے بڑی نیکی "ہمدردی" ہے۔ یہودیت کی رو سے ام الفضائل "تشرع" یعنی لفظ قانون کی پیروی ہے اور مسیحیت کے نزدیک "رحمدلی" سب سے بڑی نیکی ہے اور ان سب نیکیوں پر "فریب مقدس" کے طور پر عمل ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کی رو سے "اخلاص" یعنی اخلاقی حکم کی بجاآوری میں نیت کا ہر آلائش سے پاک ہونا ہی "راس الحسنات" ہے۔ یہی حسن نیت ہے اور یہی حسن عمل ہے۔

دوسرے موقف کی رُو سے نزول قرآن کا مقصود مکمل دستورِ حیات مہیا کرنا ہے۔ یہ مکمل دستورِ حیات تعبیر نصوص سے میسر آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مفسر کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید اصول مہیا کرنے والی کتاب ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مکمل ہدایت نصوص سے نہیں تعبیر نصوص سے میسر آتی ہے اور تعبیر انسانی ذہن کی تراشیدہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "نص" نہیں، تعبیر ہدایت ہے۔ دوسری دشواری یہ ہوگی کہ اہل السنہ کے نزدیک چاروں فقہی مسلکوں کو روا رکھنے کے لئے تعبیر میں اختلاف جائز ہے؛ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر اختلاف کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مشکل یہ ہے کہ جب سے ہمیں ان لوگوں کے مقابلے میں ناکامی ہوئی ہے جن کے پاس یہ ہدایت کاملہ نہیں ہے۔ ہم اپنی ناکامی کی تلافی نہیں کر سکے۔ یہ صورت حال قرآن سے مایوسی اور بے یقینی میں اضافہ کرتی ہے۔

جب سے معاشی انقلاب کی قیادت ہم سے چھنی اور سلاطین اقتدار سے اور قانون قوت نافذہ سے محروم ہوا اور موثرات زندگی (علم' اخلاق' تہذیب' معاشرت' معیشت' سیاست) میں تغیرات پیدا ہوئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے تقاضے صرف فقہی قوانین کی خلاف ورزی سے پورے ہونے لگے۔ فقہی ضابطے کی پابندی کرانے کے لئے واعظین کے پاس عذاب آخرت سے ڈرانے کے سوا اور کوئی حربہ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے تقاضے فقہی احکام سے انحراف کے بغیر پورے نہ ہو سکے تو عذابِ دوزخ کا خوف بے اثر ہو کر رہ گیا۔ مذہبی ذہن اب بھی قانون سازی ہی سے زندگی کی اصلاح کرنے پر مصر ہے۔ جس کی خلاف ورزی کے بغیر زندگی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور وعظ کے بے نتیجہ ہو جانے سے علماء کا اعتماد اپنے طریق کار اور اس کی نتیجہ خیزی کے باب میں متزلزل ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام پر معاشی' سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے غیر محفوظ ہونے کا احساس غالب ہے۔ وعظ ان کے لئے بے اثر ہو چکا ہے۔ انہیں حضورِ قلب سے نفرت ہو گئی ہے۔ طلب زر میں دھوکا کھانا ان کی نفسیات بن گئی ہے۔ علماء صرف واعظانہ شیوہ بیانی اور خطیبانہ شعلہ نوائی سے عوام کی اصلاح میں ناکام ہو کر خود بھی بے یقینی' بے اعتمادی اور مایوسی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ عوام ہی مصلحین اُمت اور اشتراکی انقلاب کے داعیوں کے لئے بھی میدان عمل ہیں۔ چونکہ عوام اپنی احتیاج اور نفسیاتی میلان کی بدولت دھوکا کھانا چاہتے ہیں اور اشتراکی انہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اشتراکی اپنے طریق کار کی نتیجہ خیزی کے بارے میں وثوق اور اعتماد پیدا کرتے جاتے ہیں اور علماء اپنے طریق کار کی بے تاثیری سے اپنی بے یقینی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

دراصل اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ ہم اخلاقی اصلاح علم الاخلاق

سے' معاشرے کی اصلاح عمرانیات سے' معیشت کی اصلاح معاشیات سے اور سیاسی پہلو کی اصلاح سیاسیات سے کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے لئے قرآن مجید کے بجائے انسانی استعداد کے زائیدہ علوم سے ہدایت طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ قرآن کے ایک ایسے منہاج کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جس کی بدولت نزول قرآن کی غایت کو سمجھا جاسکے اور اسے حاصل کیا جاسکے۔ اللہ پاک تو فرماتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا

مگر ہم نے "شرع" پر اپنی توجہ مرکوز کر لی اور "منہاج" کو اس لئے نظرانداز کر دیا کہ شرع پر توجہ مرکوز کرنے سے نتائج پیدا ہو رہے تھے۔

اب حالت یہ ہے کہ اخلاق کا معیار تو ارسطو کی پیروی میں حکم کے بجائے افراط و تفریط کے درمیان نقطہ اعتدال بن گیا ہے۔ معاشرے میں اساس اجتماعیت توحید و رسالت کے بجائے وطنیت یا نسلیت بن چکی ہے۔ معیشت میں انفاق و ایثار و بذل و عطا کی جگہ حرص' لالچ اور بخل نے لے لی ہے اور سیاست میں "کلمہ طیبہ بربنی معاہدہ عمرانی" کے بجائے ہوس اقتدار غالب ہے اور سیاسی طالع آزما جو ہوس اقتدار کے ذہنی مریض ہیں' قرآن مجید کی اس رہنمائی کے باوجود کہ:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

﴿انعام:١١٦﴾

جمہوریت کو ہوس اقتدار کی تسکین کا "کھل جا سم سم" سمجھ کر جمہوریت ہی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر حالت یہ ہے کہ عالم اسلام بینتالیس ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ جس کے ہر معاشرے میں شگاف پڑ چکے ہیں۔ ایک طرف نام نہاد راسخ العقیدہ ذہن ہے جو اپنے آپ کو علم دین کا وارث ہونے کی بناء پر

اقتدار کا حق دار سمجھتا ہے اور اقتدار سے محرومی کے احساس میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف جدید ذہن کا حامل گروہ ہے جو اقتدار پر قابض ہے اور باوجودیکہ اس کی حیثیت اساطین یزید کے مقابلے میں وہ بھی نہیں کہ جو سرکس کے جانور کی رِنگ ماسٹر کے سامنے ہوتی ہے، وہ اپنے آپ کو "جدید" سمجھتا ہے۔ جب جدید ذہن کو اپنے نام نہاد راسخ العقیدہ ہم وطنوں کے مقابلے میں اپنے اقتدار کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے تو وہ عالم کفر سے اپنی تائید طلب کرتا ہے اور یوں مسلم ممالک کی مقتدر قومیں عالمی سطح پر دو متخاصم سپر طاقتوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے حلیف منتخب کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی عداوت میں محاذ آرائی کر کے مسلم کشی کی جنگ میں مصروف ہوتی ہیں اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتی ہیں کہ وہ کس کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

اس حالت کو پہنچنے کا سبب یہ ہے کہ مسلم قیادتیں، خواہ مذہبی ذہن کی حامل ہوں یا جدید ذہن کی مقصدیت اور حصول مقصد کے لئے قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کے یقین سے محروم ہیں اور بے یقینی کے اعتراف، یقین کی احتیاج اور اسے پورا کرنے کی تدبیر سے بے نیاز ہیں اور قرآنی ہدایت کے برعکس "روح عصر" کے تقاضوں کی کورانہ تقلید سے اسی نظریاتی بحران (Ideological Crisis) کا شکار ہوئی چلی جا رہی ہے جس میں منزل من اللہ ہدایت سے انحراف کے نتیجے میں باقی دنیا گرفتار ہے۔

ہر مسلم معاشرے میں ایک تیسرا گروہ ہے جو مذہبی ذہن اور جدید ذہن کے افکار و نظریات کے درمیان تطبیق اور معذرت کو شانہ ہم آہنگی پیدا کر کے حصول اقتدار کی راہ ہموار کرنے میں مصروف ہے۔ قرآن کو صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کرنے والا قانون ساز مذہبی ذہن متوثرات زندگی میں تبدیلی کے نتیجے میں قانون کے بے اثر ہو جانے کی صورت میں امم سابقہ کے رہبان و احبار کی طرح ہر آزار کا علاج

خودساختہ قوانین ہی سے کرنا چاہتا ہے حالانکہ زوالِ سیرت کی ہمہ گیری کے نتیجے میں جو اقدارِ حیات پٹ گئی ہیں ان کو پیدا کرنا نہ پہلے قانون کا وظیفہ تھا نہ اب ہے۔ قانون کا وظیفہ فقط یہ ہے کہ اگر اقدار موجود ہوں اور قانون کو قوت نافذہ میسر ہو تو قانون صرف اقدار کی حفاظت کرسکتا ہے۔ مگر جب قانون کی پیروی کی امنگ باقی نہ رہی ہو تو قانون کے ذریعے اقدارِ حیات کا احیا متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ روح عصر کی جس کورانہ تقلید نے ہمیں "نظریاتی بحران" میں مبتلا کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

ذریعہ علم صرف حواس ہیں' جس کے نتیجے میں محسوسات ہی حقیقت متصور ہوتے ہیں اور محسوسات میں طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضے ہی اہم ترین حقیقت ہیں۔ لہٰذا جغرافیائی وحدت ہی عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد بن جاتی ہے۔

معاشی مفاد ہی اہم ترین مفاد ہے۔

سیاسی تصور ہی سب سے زیادہ ولولہ انگیز تصور ہے۔

اگر ماورائی حقائق کے افکار کے بجائے ہم نے قرآنی ہدایت کے نتائج کی تجربی توثیق و شہادت کو یقین کی اساس تصور کیا ہوتا تو ہم کبھی بے یقینی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے۔

اگر ہم نے معاشی مفاد کو اہم ترین مفاد سمجھ کر حرص' لالچ اور خودغرضی میں مبتلا ہونے کے بجائے معاشی نشوونما دینے کو اہم ترین مفاد سمجھا ہوتا تو ہم خودغرضی میں مبتلا ہو کر اپنے ہی لوگوں کا معاشی استحصال نہ کر رہے ہوتے اور معاشی انقلاب کی قیادت سے محروم نہ ہو گئے ہوتے۔

اور اگر ہم نے سیاسی تصور کو جدید اقوام کی تقلید میں سب سے زیادہ ولولہ

انگیز تصور نہ سمجھا ہوتا تو ہم ان کی پیروی میں اپنے ہی لوگوں کا سیاسی استحصال کرنے کے بجائے سیاسی نشوونما دینے کا ولولہ پیدا کرتے۔

اب نظریاتی بحران میں مبتلا دورِ جدید کی طرف سے قرآن مجید کے لئے یہ ایک چیلنج ہے کہ:

کیا قرآن نظریاتی بحران کا حتمی علاج پیش کر سکتا ہے؟

اس چیلنج کو قبول کرنے کی شرط اس سوال کا جواب دینے سے پوری ہوگی کہ:

⇦ قرآن کی وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر قرآن مجید تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں سے ہر پہلو کے تمام تقاضے پورے کرنے کی ضمانت رکھتا ہے؟

⇦ یہ خصوصیت قرآن مجید کا "حجتہ من بعد الرسل" ہونا ہے۔

⇦ قرآن حجتہ من بعد الرسل ہے۔

قرآن کے دور مابعد رسالت میں حجتہ ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ:

⇦ دورِ رسالت میں ہر کامیابی کتاب و سنت کی پیروی کی بدولت حاصل ہوئی ہو۔

⇦ دورِ مابعد رسالت میں ہر زوال کتاب و سنت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہو۔

⇦ زوال پذیر ہو جانے کے بعد زوال سے نکلنے کی کوئی جدوجہد کتاب و سنت کی پیروی کے علاوہ کسی اور تدبیر سے ممکن نہ ہو۔

یہ متعین کرنے کے لئے ہر کمال کتاب و سنت کی پیروی سے اور ہر زوال کتاب و سنت کی خلاف ورزی سے وابستہ ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے ہر پہلو کے تمام پسندیدہ نتائج کو کتاب و سنت کی پیروی کے حوالے سے اور تمام ناپسندیدہ

نتائج کو کتاب و سنت کی خلاف ورزی کے حوالے سے متعین کرنا ہو گا۔

اگر ہم نے قرآن مجید کی اس خصوصیت کو فراموش نہ کیا ہوتا تو یہ اعتماد کبھی زائل نہ ہوتا کہ وہ تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں سے ہر پہلو کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لئے روشنی' رہنمائی اور خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے کی ضامن ہدایت ہے مگر زوال سیرت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے اندر نہ یہ شعور باقی رہا کہ تاریخ کیا ہے؟ نہ یہ کہ تاریخی جدوجہد کے نتائج کس قانون سے متعین ہوتے ہیں نہ یہ کہ تاریخ کے مختلف ادوار کیا ہیں' نہ یہ کہ زندگی کے مختلف پہلو کیا ہیں اور نہ یہ کہ زندگی کے ہر پہلو کے تقاضے کیا ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کے انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی پہلوؤں کے پیش نظر اپنی آرزو' اپنے نصب العین' اپنے نظام فکر و عمل (کتاب و سنت) اپنے ملی تشخص اور اپنی تاریخ کے حوالے سے اپنی اصطلاحوں میں غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر اپنا نصب العین پیش نظر نہ رہے تو فکر و عمل کا رخ متعین نہیں رہتا۔ اور یہی زوال ہے۔ اور اگر نظام فکر و عمل (کتاب و سنت) کی جگہ انسانی استعداد کا زائیدہ فکر و عمل لے لے تو انحراف کی راہ پر آ جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر اصطلاحیں بدل جائیں تو بحث و نظر کی کائنات بدل جاتی ہے۔

ہم نے جب "کتاب" کا مفہوم لغت سے متعین کرنے کی کوشش کی تو "کتاب" صحف ابراہیم کی تمثیل پر اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ قرار پائی اور قرآن توریت کی تمثیل پر کتاب متصور ہوا۔ چنانچہ عالمی سطح پر اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد مذہبی ذہن اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کی نسبت مایوسی میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ توریت کی تقدیر یہ تھی کہ اس کے پیرو زوال میں مبتلا ہونے کے بعد نئی بعثت کے بغیر کبھی بھی زوال سے نہ نکل سکتے تھے اس لئے ختم نبوت کے بعد مذہبی اسلام

کی نسبت بھی مایوس ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

تاریخ کے دور

ہماری تاریخ کے سات دور ہیں:

۱۔ دورِ جاہلیت

۲۔ دورِ رسالت

۳۔ دورِ خلافت راشدہ

۴۔ دورِ ملوکیت' معاہدۂ عمرانی کے ساتھ

۵۔ دورِ ملوکیت' معاہدۂ عمرانی کے بغیر

۶۔ ترکان عثمانی کی خلافت کے خاتمے کے بعد سے

۷۔ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز سے

دورِ جاہلیت

جاہلیت کے دور میں بالفعل فطرت کے منضبط نہ ہونے کی وجہ سے انفرادی زندگی کا ذہنی پہلو کائنات اور زندگی کو بے مقصد سمجھنے کی بنا پر اپنی جدوجہد کو کوئی رخ نہ دے سکا' اس لئے بے راہ روی میں مبتلا ہوگیا۔ اسی طرح ایمانی پہلو کامیابی کے یقین سے محروم تھا اور اخلاقی پہلو میں ضبط و انقیاد ناپید تھے۔ اجتماعی زندگی کے معاشرتی پہلو میں خودپسندی اور نسلی تفاخر غالب تھا۔ معاشی پہلو میں حرص' لالچ اور بخل غالب تھا۔ سیاسی پہلو ہوس اقتدار کا شکار تھا۔ اور بین الاقوامی پہلو عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہونے کی بناء پر امن و عافیت اور سکون و طمانیت سے محروم تھا۔

زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ان خصائص نے جو ماحول پیدا کیا تھا وہ یہ تھا

کہیں جان لینے کے لئے' کہیں جان بچانے کے لئے' کہیں جان کے بدلے جان لینے کے لئے' کہیں مال چھیننے کے لئے' کہیں مال بچانے کے لئے' کہیں چھینے ہوئے مال کا انتقام لینے کے لئے' کہیں آبرو لوٹنے کے لئے' کہیں آبرو بچانے کے لئے' کہیں لٹی ہوئی آبرو کا بدلہ لینے کے لئے' کہیں غلبہ حاصل کرنے کے لئے' کہیں اقتدار بچانے کے لئے' کہیں کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لینے کے لئے ہر جگہ خون بہایا جا رہا تھا اور بین الاقوامی سطح پر قیصر و کسریٰ کا عناد و عداوت امن عالم کے لئے خطرہ تھا اور انسانیت امن و عافیت اور سکون و اطمینان سے محروم تھی۔

دورِ رسالت

دورِ رسالت میں تمام آزاروں کا علاج جس تدریج سے ہوا اس کی تفصیل یہ ہے۔ یہ دور تین مراحل پر مشتمل ہے:

ا۔ بعثت سے ہجرت تک کا مکی دور

یہ انفرادی زندگی کے ذہنی' ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح پر مشتمل ہے اور اس اصلاح کے لئے ہدایت ہونے کی حیثیت سے قرآن کا دعویٰ یہ ہے:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ ﴿المزمل:۱۹﴾

(یہ تذکرہ ہے جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے۔)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ زندگی میں ہر بہتر تغیر کسی نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مکی دور میں انفرادی زندگی کے تینوں پہلوؤں کی اصلاح "انسان مرتضٰی" یعنی ایسا انسان بننے سے ہوئی جسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ اسی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں اُس ذہنی پہلو کی بھی اصلاح ہوئی جس کی خصوصیت زندگی اور کائنات کے مقصد کو سمجھنا تھا۔ پیغمبرانہ تربیت نے تخلیق بالباطل اور تخلیق باللعب کی نفی اور تخلیق بالحق کے اثبات کا یقین دلایا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ ﴿ص:۲۷﴾

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ ﴿الانبیاء:۱۶﴾

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ ﴿الاحقاف:۳﴾

ایک صالح معاشرے کا ماحول یقین کی آبیاری کے لئے سازگار ہو سکتا ہے۔ جس میں انسانی شخصیت کو نشوونما جا رہی ہو اور ہر قدم پر اس سے مستفید ہونے والے خود اپنے اندر بھی اور دوسروں کے اندر بھی ایک تبدیلی محسوس کرتے ہوں۔

انسانی شخصیت کا حیاتی پہلو خوراک، لباس اور رہائش کا طلب گار ہے۔ اگر اس طلب کو پورا کرنے کے لئے انحراف کا راستہ اختیار نہ کرنا پڑے اور یہ مطالبہ

ایمان باللہ کے تقاضے سے پورا ہو تو یقین کی آبیاری ہوگی۔ شخصیت کا ایک اور پہلو جو عمرانی حیاتی پہلو ہے اور جو ازدواج اور بقائے نسل کا طلب گار ہے اس کی تسکین کے لئے بھی ایمان والے ہی سازگار احوال مہیا کریں تو ایمان باللہ میں رسوخ حاصل ہوگا۔

انسانی شخصیت کا عمرانی ثقافتی پہلو تعلیم اور کسب معاش کی تربیت کا طلب گار ہے جس کی ذمہ داری ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے افراد اور معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔ حیات اجتماعی کے معاشرتی پہلو میں جب پیغمبرانہ تربیت سے خود پسندی اور نسلی تفاخر کے بجائے اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے تحت اخوت کا شعور واضح ہوتا ہے اور عمرانی عمل اس معیار کے مطابق ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔

لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔

﴿حدیث نبوی ﷺ﴾

(تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔)

تو زندگی مشرکانہ میلانات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ ﴿آل عمران: ۹۲﴾ کی رو سے اخلاقی فضیلت (بِرّ) انفاق سے میسر آتی ہے' جو انفاق کرنے والے کی نیکی ہے اور س سے مستفید ہونے والے کی معیشت ہے۔ جس کسی کا معاشی تخلیقی جدوجہد کا تعلق خدا کے نام پر رفع ہوگا وہ مشرکانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا۔ بعثت سے ...ت تک ایمان کی آبیاری کا یہ طرزِ عمل کی دور کے معذور' مقہور اور مجبور'

معاشرے کو خدا کی ایک طاقت کے مؤثر ہونے کا یقین دلا رہا تھا مگر معاشرتی اعتبار سے مغلوب، معاشی اعتبار سے پسماندہ، مجبور اور سیاسی اعتبار سے مقہور معاشرے کا مسئلہ یہ تھا کہ اس ضعف و اضمحلال سے نکلنے کی صورت کیا ہو؟

(ب) ہجرت سے فتح مکہ تک

معاشرتی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی نشوونما کے اس دور میں اجتماعی زندگی کے تینوں پہلوؤں کے مسائل کو حل کرسکنے کے لئے قرآن کا اپنی نسبت دعویٰ ہے:

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ○ ﴿الزخرف:۴۴﴾

معاشرتی پہلو میں إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کی بنیاد پر خودپسندی کے بجائے اخوت کی تربیت اور اخوت کے اس معیار کے مطابق کہ:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ ﴿حدیث﴾

زندگی کی اصلاح ہوئی اور معاشی پہلو میں زندگی حرص، لالچ اور بخل کے بجائے ایثار و انفاق اور بذل و عطا کے تقاضوں سے متعین ہونے لگی اور سیاسی پہلو میں کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے قیام سے مطیع اور مطاع دونوں یکساں طور پر منزل من اللہ احکام کے پابند ہوگئے اور ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنے کے نصب العین کے حصول کی جدوجہد کرنے لگے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو، جو اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو (جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں)، جس کے استحکام کی اساس حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت اور آپ ﷺ سے غیر منقسم وفاداری ہو۔ یہ معاشرہ اخلاقی اعتبار سے صحت مند، معاشی اعتبار سے عادلانہ یعنی تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرنے کا کفیل ---- معاشرتی اعتبار سے مستحکم اور

سیاسی اعتبار سے کلمہ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی کو وجود میں لا کر سیاسی تناقض سے پاک ہو گیا۔

یہ سب کچھ ہجرت سے فتح مکہ تک دورِ رسالت کے دوسرے مرحلے اور مدنی زندگی کے پہلے دور میں وقوع پذیر ہو کر رہا۔ مگر بین الاقوامی زندگی کی اس خاصیت کی بناء پر کہ وہ عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کی مظہر ہے۔ زندگی خوف و غم سے محفوظ نہ رہ سکتی تھی اس لئے دین حق کے غلبے کے لئے جدوجہد ضروری تھی تا کہ ہمہ گیر امن و عافیت اور سکون و طمانیت میسر آ جائے۔

(ج) فتح مکہ سے حجتہ الوداع تک

یہ دورِ رسالت کا تیسرا مرحلہ ہے جو بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق کے لئے جدوجہد کر کے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○ کے چیلنج کو پورا کرنے کی جدوجہد اور جس کے اتمام تک پہنچنے کی تیاری مکی دور کی ذہنی' ایمانی اور اخلاقی اصلاح اور مدنی زندگی کے پہلے دور میں مثالی معاشرے کے قیام کی سعی پر مشتمل ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق و تکذیب کے تضاد کو گہرا کر کے' امت مسلمہ کی وفاداری کو متعین کر کے' اجتماعی حیثیت سے منضبط اور منقاد بنا کر تصادم کو فیصلہ کن بنانے کے لئے یہ تضاد ضروری تھا۔

اسلام کی نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما دینے اور کفر کی مفاد پرستی کے تحت نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما کو روکنے میں اس کی ضمانت تھی کہ یہ تحریک تخریب محض پر منتج نہیں ہو سکتی۔ اس سے مثبت تعمیری نتائج بر آمد ہو کر رہیں گے۔

اس جدوجہد کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ جب تک تصادم کو دعوت دینے کی طاقت نہیں ہے پروگرام کیا ہو؟ تا کہ ولولہ سرد نہ ہو' مقصد کے قریب تر ہوتے جائیں اور

قبل از وقت تصادم کو التوا میں رکھنے پر اس وقت تک قادر رہیں جب تک تصادم کو خود دعوت دے سکیں۔ بحیثیت صحیفہ انقلاب کے اس مسئلے کا قرآنی حل یہ تھا کہ انقلابی جماعت کی معاشی تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کیا جائے تا کہ وہ اتنی مستحکم ہو جائے کہ تصادم کر سکے۔ اس کی تدبیر وہ مواخات تھی جو پیغمبر انقلاب علیہ السلام والتحیتہ نے مہاجرین اور انصارِ مدینہ کے درمیان قائم فرمائی تھی۔

اس دور کا ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ دعوت انقلاب کے کتنے اقسام کے ردِ عمل پیدا ہوں گے اور ان کی بے خطا پیش بینی کیسے کی جائے؟ اس مسئلے کا جو حل قرآن مجید سے میسر آتا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت انقلاب کے تین ردِ عمل ہیں۔

- ایمان
- کفر اور
- منافقت

اس سے تین گروہ پیدا ہوتے ہیں:

- مومن
- کافر اور
- منافق

ان میں سے ہر ایک کی نفسیات نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ انقلابی جدوجہد کو اتمام تک پہنچانا اس سوال کو حل کرنے کے ساتھ مشروط تھا کہ انقلابی قیادت ہر ردِ عمل کے جواب میں کیا طرزِ عمل اختیار کرے کہ اسے صورت حال پر تصرف کامل حاصل ہو جائے؟

اس مسئلے کا قرآنی حل یہ تھا کہ:

مومنوں کی دلنوازی کی جائے۔ ان کے اعمال کی آبیاری کی جائے۔ انہیں معاشی اعتبار سے اتنا مستحکم کیا جائے کہ ان کی معاشی تخلیقی جدوجہد میں تعطل باقی نہ رہے اور وہ تصادم کے لئے تیار ہو سکیں۔

منافقوں کی پردہ دری کی جائے تا کہ وہ کافروں سے جا ملیں یا حزب اللہ میں شامل ہو جائیں۔

کافروں کو طاقت سے زیر کرکے، قبل از مرگ زندگی میں باطل کو شکست دے کر بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق کے قیام سے دین حق کی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ کرا کے ان پر حجت تمام کی جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہ سب کچھ ہوا اور حجتہ الوداع تک بین الاقوامی سطح پر دین حق کا غلبہ اس حد تک مسلم ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبے میں فرمایا کہ:

"آج دنیا کے تمام جاہلانہ دستور میرے قدموں کے نیچے ہیں۔"

مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ سابقین و اولین کی کامیابی کے بعد لاحقین و آخرین زوال پذیر نہیں ہوں گے کیونکہ فطرت انسانی میں بالقوۃ فطرت اور بالفعل فطرت کے تضاد اور اس کی نگہداری سے غفلت کا لازمی نتیجہ تھا کہ زوال ہو اور لاحقین و آخرین کو بھی اپنے ارتقاء کے سلسلے میں ان ہی مراحل سے گزرنا ضروری تھا جن سے سابقین و اولین گزرے تھے بلکہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واضح کر دیا گیا تھا کہ اقوام و امم صرف دو خطاؤں پر اقتدار سے محروم کر دیئے جانے کی سزاوار ہو سکتی ہیں۔ ایک جہاد سے غفلت کے نتیجے میں (توبہ) اور دوسرے انفاق فی سبیل اللہ میں بخل کرنے پر (محمد) اگر ہم جستجو کریں تو ان دو خطاؤں سے صرف ہمارے ہی زوال کی توجیہ نہیں ہوتی بلکہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں اور ہر قوم کے زوال کی توجیہ بھی

اسی اصول پر ہوگی کہ جنگ سے گریز اور معاشی توازن پیدا کرنے میں بخل ہی ہر قوم کے زوال کا موجب ہوتا ہی کیونکہ پیغمبرانہ اصلاح کی ذمہ داری "ختم نبوت" کے بعد جہاد کو سونپی گئی ہے اور انفاق ہی معاشی عدم توازن کا مداوا ہے جس سے غفلت کی سزا اقتدار سے محروم کردیا جاتا ہے۔

دورِ مابعد رسالت ---- خلافت راشدہ کا دور

تاریخ اسلام دو ادوار میں منقسم ہوتی ہے۔

۱۔ دورِ رسالت اور

۲۔ دورِ مابعد رسالت

دورِ رسالت مقصودِ بعثت کے حصول کی جدوجہد کے اتمام کو پہنچنے کا دور ہے اور دورِ مابعد رسالت ان اقدارِ حیات کی حفاظت کے لئے جدوجہد کا دور ہے جو دورِ رسالت میں قائم ہوگئی تھیں اور اگر وہ اقدار امت کے زوال پذیر ہونے کی بنا پر مٹ جائیں تو دورِ مابعد رسالت میں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد ضروری ہے۔

جو لوگ ان دو ادوار کے تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور اپنی تاریخ کی تعبیر دشمنان اسلام سے اخذ کرتے ہیں وہ دورِ مابعد رسالت کو اسلام سے انکار، سرکشی اور بغاوت کا دور تصور کرتے ہیں اور اس دور کی تاریخ سے خاتم الرسل علیہ التسلیم والتحیتہ کی (خاکم بدہن) ناکامی کے شواہد مہیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جو ذہن دشمنان اسلام کے زیر اثر جمل اور صفین کی بناء پر خلافت راشدہ کے دور کو بھی اسلام سے انحراف، انکار، سرکشی اور بغاوت کے دور سے تعبیر کرتا ہے وہ اپنی تائید میں یہ دلیل لاتا ہے کہ بہترین دور، تیس سال سے زیادہ نہیں چل سکا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ طرز فکر

رکھنے والا ذہن سقیفہ بنی ساعدہ کے اختلاف کو بھی باتفاق رائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر انجام پذیر ہونے کے باوجود اسلام کے منافی سمجھتا ہے۔ پھر زکوٰۃ کے مسئلے پر ارتداد کو بھی اس کے انجام کو نظرانداز کرکے اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ پھر تینوں خلفائے راشدین کا انجام ان کی شہادت پر ہوا۔ اسے بھی اسلام دشمن ذہن اسلام کے خلاف ایک دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ حالانکہ ان تینوں کی شہادت ایک نصب العین کی خاطر ہوئی تھی۔ جمل اور صفین میں ہزاروں افراد کی ہلاکت کو مسلمانوں کی خون آشامی سے وابستہ کرتا ہے حالانکہ یہ اختلافات ایسے نہ تھے جن کی پیش بینی نہ کی گئی ہو یا قرآن مجید نے ان کا علاج تجویز نہ کیا ہو یعنی اگر مسلمان آپس میں قتال کریں تو سب مل کر صلح کرانے کی سعی کریں اور جو صلح کو نہ مانے اس کے خلاف سب مل کر قتال کریں (موازنہ کریں الحجرات:۹) چنانچہ جمل اور صفین دونوں میں صلح ہوگئی۔ جانبین میں وہ افراد بھی تھے جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے اور صحابہ اکرامؓ کی صفات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں محبت ڈال دی ہے اور ان کے دلوں کو ایمان سے سجا دیا ہے اور کفر وگناہ اور نافرمانی سے انہیں بیزار کر دیا۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔ (موازنہ کریں الحجرات:۷،۸)

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ انسانی فیصلے میں غلطی تو ہوسکتی ہے لیکن اس سے اعلیٰ کردار کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ جو جس چیز کو حق سمجھ رہا ہے اس پر کٹ مرے۔ کیونکہ سیرت و کردار' پسندیدہ و ناپسندیدہ کے درمیان امتیاز کے شعور اور اس کی قیمت ادا کرنے کا نام ہے۔ یہ طرز عمل فساد نیت کا نہیں اخلاص باللہ کا نتیجہ تھا۔ دراصل ہم نے تاریخ کے قرآنی تصور کا شعور پیدا کرنے کے بجائے تاریخ کو عروج و زوال کی توجیہ کا علم قرار دیا ہے اور رواۃ حدیث کے رد و قبول

کا جو معیار ہم نے اسماء الرجال کی صورت میں طے کیا تھا' اسے ہم نے اپنی غفلت کی بناء پر رواۃ تاریخ کے رد عمل پر منطبق نہیں کیا۔ ورنہ فرقہ پرستی کے تحت مسخ کی جانے والی تاریخ میں حق و باطل کے درمیان امتیاز آج بھی ممکن ہے۔ مگر ہم نے تاریخ کو صرف زوال کی تاریخ کا علم تصور کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ابن خلدون' جو تاریخ کے امام سمجھے جاتے ہیں' زوال ہی کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"جب حیات اجتماعی میں عصبیت زائل ہو جاتی ہے تو معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔"

وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ عصبیت اخلاص باللہ کے باقی نہ رہنے سے زائل ہوتی ہے اور اخلاص باللہ کا دوبارہ پیدا کرنا ناممکن نہیں ہے۔ ہم اپنی تاریخ سے مایوس اس لئے ہیں کہ تاریخ کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ جس معاشرے کو قرآن مخاطب کر رہا ہے گویا وہ کبھی وجود میں آیا ہی نہیں تھا۔ یہ تاثر دور ہو سکتا ہے اگر ہم تاریخ اسلام کو اپنی حیات اجتماعی کے ولولے کا سرچشمہ سمجھ کر تاریخ پر تحقیق کے ذریعے راویان تاریخ کے رد و قبول کے لئے بھی وہی معیار منطبق کریں جو راویان حدیث کی روایت کے رد و قبول کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ تاریخی حقائق آج بھی سامنے آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ روایت کی پیروی میں ہم درایت سے یکسر بے نیاز نہ ہو جائیں۔

دورِ ملوکیت

(الف) موثرات حیات میں تبدیلی

خلافت علی منہاج الرسالہ (خلافت راشدہ) کے بعد ملوکیت کا دور آیا اور پیغمبرانہ قیادت کی اخلاقی تعلیمات کا اثر کم ہونا شروع ہوا تو موثرات زندگی میں تبدیلی

کی ابتداء ہوگئی۔ موثرات زندگی سیاست، معیشت، معاشرت، اخلاق، مذہب اور علم ہیں۔ موثرات حیات میں تبدیلی اس فرق سے عبارت ہے کہ زاویہ نگاہ بدل جائے، طرز عمل بدلے یا نہ بدلے۔ چنانچہ انتخابِ خلیفہ کے طریق کار میں عام انتخاب، نامزدگی، چند ناموں میں سے ایک نام منصب خلافت کے لئے انتخاب کرنے کی روایت موجود تھی۔ ملوکیت کے نظام میں جو تبدیلی نقطہ نگاہ میں واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ اقتدار خاندان ہی میں محفوظ رہے اور طرز عمل جو نہیں بدلا گیا وہ یہ تھا کہ عام انتخاب یا چند ناموں میں سے کسی ایک نام کو اختیار کرنے کے بجائے "نامزدگی" کی روایت کو اپنایا گیا۔ اس طرز عمل سے کہ پوری اُمت میں سے بہترین فرد کو رائے عامہ سے منتخب کرنے کے بجائے نامزدگی کے ذریعے خلیفہ کو برسراقتدار لایا جائے، سیاست میں ایک موثر حیات کی حیثیت سے تبدیلی واقع ہوگئی اور رائے عامہ سے بہترین فرد کے منصب خلافت پر فائز ہوسکنے کا راستہ بند ہوگیا۔

(ب) معاشرت میں تبدیلی

جب معاشرتی زندگی میں نسلی تضاد ---- عربی عجمی کا، آزاد اور غلام کا، حاکم و محکوم کا امتیاز --- غالب آنے لگا تو معاشرت میں بھی موثر حیات کی حیثیت سے تغیر واقع ہوگیا اور معاشرتی اعتبار سے یہ طبقاتی امتیاز غالب آنے لگا کہ انتہائی عیش و عشرت میں بسر کرنے والے اور ضروریات زندگی پر قناعت کرنے والے ایسے طبقات وجود میں آگئے جن میں باہم دلسوزی کم ہوگئی۔ تو یہ بھی معاشرتی زندگی میں موثر حیات کی حیثیت سے ایک نمایاں فرق تھا جو پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا۔

(ج) معاشی پہلو میں تبدیلی

معاشی پہلو میں طریق تخلیق دولت، گلہ بانی یا تجارت یا زراعت یا جاگیرداری

میں سے کسی نظام کا اس کمی کے ساتھ غالب آنا کہ عادلانہ معیشت کی خاطر تخلیقی جدوجہد کے تسلسل کو رفع کرنا بھی فریضہ متصور ہونے کے بجائے عمل مستحب متصور ہونے لگا۔ اور فاعل اخلاق کی نیکی اور دوسروں کی معیشت کے درمیان باہمی جوابی اضافی مستضائی اور وجوبی طور پر مربوط ہونا ملحوظ نہ رہے تو یہ طرزِ عمل معاشی پہلو میں بحیثیت ایک موثر حیات کے بہت بڑا تغیر تھا۔

(د) اخلاقی پہلو میں تبدیلی

اخلاقی پہلو میں عزیمت کی جگہ رخصت نے لینی شروع کر دی مگر جب قرآن مجید کی اس آیت پاک سے ہَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ ؕ طلب علم کا ولولہ پیدا ہوا تو علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے درمیان امتیاز پیش نظر نہ رہ سکا۔ اور علم بالوحی اور اس سے ماخوذ علوم' جن میں تفسیر' حدیث اور فقہ شامل تھے اور انسانی استعداد کے زائیدہ تمدنی علوم' مثلاً فلسفہ' اخلاقیات' عمرانیات' معاشیات' سیاسیات' قانون' نیز اہل کتاب اور غیراہل کتاب کے افکار سے ماخوذ علوم سب ایک سطح پر آ گئے اور جو علوم متمدن دنیا نے پیدا کئے تھے ان سے محرومی کا احساس اتنا غالب آیا کہ جن علوم سے پوری نوع انسانی محروم تھی یعنی جو وحی سے میسر آئے تھے اور جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؕ ﴿البقرة:١٥١﴾

ان کے حامل ہونے کا اعتماد بھی سہارا نہ دے سکا۔ اور شعور علمی کا ہم آہنگی پیدا کرنے کا تقاضا شعورِ علمی کے ویسے ہی شدید تقاضے' یعنی مماثل فضائل و اقدار کے مابین امتیازات کو ملحوظ رکھنے کے تقاضے پر غالب آ گیا اور ہماری فکری روایت علوم کے درمیان صرف تطبیق بن کر رہ گئی تو معتزلہ سے لے کر امام غزالی' ابن

رشد، شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال تک کے فکر میں شعورِ علمی کے تقاضوں کے شعورِ مذہبی کے مطالبات پر غالب آجانے کی وجہ سے پوری تاریخ فکر مذہبی تطبیق کی تاریخ بن گئی۔ انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی پہلوؤں میں انقلاب برپا کرنے کے لئے ... بالوحی کے اثرات بروئے کار نہ لائے جاسکے۔

ہ تکمیل دین کے مفہوم میں تبدیلی

"تکمیل دین" کا قرآنی تصور بھی "تکمیل فقہ" میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اور جب ایک تاریخی حادثے کے طور پر دورِ ملوکیت کے آغاز ہی میں یہ تقسیم کار عمل میں آئی کہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت سلاطین کے ذمے، قانون سازی علماء کے ذمے اور تزکیہ و روحانیت صوفیہ کے ذمے ---- تو جب تک سلاطین اقتدار سے محروم نہیں ہوگئے، قانون کو قوت نافذہ میسر رہی۔ جب قانون قوت نافذہ سے محروم ہوا تو قانون اسلامی اقدار کی حفاظت سے عاجز ہوگیا اور قانون ساز مذہبی ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ قانون کا وظیفہ اقدارِ حیات کو ان کے مٹ جانے کے بعد پیدا کرنا نہیں۔ اگر اقدارِ حیات زندہ ہوں اور قانون کو قوت نافذہ میسر ہو تو قانون صرف ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ مذہبی ذہن موثرات زندگی کے بدل جانے کے بعد تمدنی نظام کے عادی ہونے کے باعث قانون پر منحصر رہا اور اپنے خلاف طاقت کا استعمال دیکھ کر مضمحل ہوگیا۔

کتاب کو ماورائی حقائق پر "ایمان" کے بجائے ماورائی حقائق کے "علم" کا ذریعہ سمجھا اور ان کو سمجھنے کے لئے علم کے بنیادی تصورات (وجود، مطلق، بسیط، قدیم، واجب، علت) کو ذریعہ بنایا اور عقلیت کی رُو سے وجودِ باری کو قضیہ تحلیلیہ کے انداز میں متجمع صفات ذات تصور کیا تو اسم اور مسمی عین یکدیگر متصور ہوئے اور وجود اللہ ایک ایسا اصول قرار پایا جس کے متوازی نفس الامر میں اس کا موجود ہونا

متصور نہ ہوسکا۔ علمی مقولات کے حوالے سے وجود اللہ کا اثبات ناممکن ہوگیا اور وجوب وجود سے ایک طرف جبر متصور ہوا، دوسری طرف ذات باری کی تنزیہ کے بجائے اس کے "ساری فی الکائنات" ہونے پر اصرار لازم آیا۔ اور اس کے تصورِ مطلق ہونے سے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اور خالق و باری ہونے، رَحْمٰنُ وَرَحِيْم ہونے، ستار و غفار ہونے اور ذوالفضل ہونے اور تواب اور اس عالم کے ماورا ہونے کا اثبات نہ ہوسکا۔

جب انسان کی مسئولیت، جوابدہی اور جزا و سزا کے لئے اپنے ارادے میں صاحب اختیار ہونا ضروری سمجھا گیا اور اختیار کو سمجھنے کے لئے اس دلیل نے کہ:

الف	ب	کی علت ہے
ب	ج	کی علت ہے
الف	ج	کی علت ہے

یہ شکل اختیار کی کہ:

الف (خدا) ب (اختیار) کی علت ہے

ب (اختیار) ج (نیکی یا بدی) کی علت ہے

الف (خدا) ج (نیکی یا بدی) کی علت ہے

تو علمی توجیہ کی خاطر عمل کے مسلمہ کا انکار لازم آیا اور متکلمین یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ جس "اختیار" کی کوئی علت ہو تو وہ "جبر" ہی ہوتا ہے اور اختیار کو بین الجبر والاختیار سے بدل کر جبر و اختیار میں التباس پیدا کیا تو جس ذہن نے اُحِبُّ ضَالَّةَ الْمُؤْمِنِ کا سہارا لیا وہ ذات و صفات الوہیت کو ارسطو کے مقولات جوہر و عرض کی تمثیل پر قیاس کرنے کی بناء پر "صفات" کو "عین ذات" کبھی

"زاید علی الذات" کبھی "لاعین ولا غیر" کی حیثیت سے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی عقیدے کو ایمان کے بجائے اختیار کر کے اس کی تائید میں دلیل عقلی مہیا کرنے کی جستجو کے تحت ہستی باری تعالیٰ کا ثبوت ممانیت کی دلیل میں منحصر کرنے سے مادے کا "قدم" تسلیم کرنے پر اس لئے مجبور ہوا کہ عقل کے نزدیک عدم محض سے تخلیق متصور نہ تھی اور کبھی متکلمین کی اس غلطی کے ازالے کے لئے صوفیانہ ذہن وجدان کو ذریعہ علم حقیقت مان کر ظہور و بروز و کمون کی صورت میں تخلیق کو تعینات اسماء و صفات سے تعبیر کر کے وحدت و کثرت کے تعلق کو سمجھتا اور سمجھاتا رہا۔ کیونکہ اس کے نزدیک بھی عدم محض سے تخلیق متصور نہ تھی۔ "وجدان" بھی عقل نظری ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعورِ علمی کے مسلمات، جنہیں تخلیق نتائج کے لئے تسلیم کیا گیا تھا توجیہ کے مضمرات کی نذر ہو گئے اور تمام ماورائی حقائق ایسے تصورات سے زیادہ متصور نہ ہو سکے جن کا اسم ہی ان کا مسمی تھا۔ یہ موثرات حیات میں ایک موثر کی حیثیت سے "علم" کے نمونے میں تبدیلی کا نتیجہ تھا کیونکہ "علم بالوحی" اور "انسانی علم" کے مابین امتیاز کا شعور باقی نہ رہ سکا تھا۔

(د) اصطلاحات میں تغیر

دورِ مابعد رسالت میں غور و فکر کی اصطلاحات کے بدل جانے سے "تکمیل دین" کا تصور بھی "تکمیل فقہ" میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس تبدیلی نے تحریف معنوی کے نتیجے میں امت مسلمہ کو اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں امم سابقہ تحریف لفظی سے پہنچ گئی تھیں اور قرآنی وحی کا ایک ایک لفظ اور زیر زبر تک محفوظ ہونے کے باوجود اس کی عطا کردہ ہدایت کی نتیجہ خیزی کا یقین برقرار نہ رہ سکا۔

"تکمیل دین" نے نوع انسانی کو نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز کیا تھا اس

لئے "ختم نبوت" پر ایمان لازم آیا تھا۔ مگر ختم نبوت سے تکمیل دین کو اخذ کرنے والا ذہن ختم نبوت کے بعد فکر اور قیادت میں خلا محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنے اپنے فکر اور اپنی اپنی قیادت کی بنیاد پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش سے امت میں اختلافات بڑھتے چلے گئے۔

خلافتِ عثمانی کا خاتمہ

ترکان عثمانی کی خلافت بھی ملوکیت ہی تھی مگر عالم اسلام کی مرکزیت قائم تھی۔ جب سید جمال الدین افغانی نے پان اسلام ازم تحریک کے تحت اتحاد عالم اسلامی کے لئے جدوجہد فرمائی تو دورِ جدید کی اسلام دشمن ملی طاقتوں نے مسئلہ شرق (Eastern Questions) اس شدومد سے اٹھایا کہ ترکان عثمانی کے خلاف سازش کے نتیجے میں خود ترکان عثمانی نے خلافت عثمانی کو ختم کر دیا اور عالم اسلام کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ ہمیں یہ حقیقت نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ علمی دنیا میں تو کوئی نیا اور نادر خیال پیش کرنا کمال متصور ہو سکتا ہے مگر سیاسی دنیا میں کامیابی اور نتیجہ خیزی معیار ہے' ندرت خیال نہیں۔ اتحادِ عالم اسلامی کی یہ تحریک اس لئے کامیاب نہ ہو سکی کہ اس دور میں مسلم اقوام پر مغربی اقوام کو غلبہ حاصل تھا اور تمام اسلامی ممالک ایک سطح پر اتحادِ عالم اسلامی کی تشکیل پر قادر نہ تھے۔ سید جمال الدین افغانی کے برعکس اس "لرد فرنگی" (سرسید علیہ الرحمہ) کا موقف زیادہ صحیح تھا جو اتحادِ عالم اسلامی سے پہلے ممالک اسلامی کی آزادی کو ضروری سمجھتا تھا۔ جس نے برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے شعور کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کی جدوجہد کے نتائج پر تحریک پاکستان کی اساس بھی رکھی گئی تھی--- اللہ پاک ان کی پرخلوص مساعی کی جزا عطا فرمائے۔

خلافت ثانی کے خاتمے کے بعد سے عالم اسلام کے زوال و اختلال سے نکلنے کی جدوجہد سے مسلمان دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ آج سینتالیس مسلم ممالک' بااقتدار ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں مگر بین الاقوامی زندگی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کی مظہر ہے---- اور یہی صورت حال عالم اسلام کے اتحاد کی محرک اور متقاضی ہے۔

پندرھویں صدی کا آغاز

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز اس امید اور یقین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی وحی کی عطا کردہ رہنمائی کو واجب التعمیل سمجھ کر اس کی روشنی میں اتحادِ عالم اسلامی کی جدوجہد کی جائے۔

مگر امید و یقین اور خود اعتمادی سے ابتدا کیسے کر سکتے ہیں؟

آغازِ بعثت سے حجتہ الوداع تک خیرالقرون میں مقصود کو موجود بنانے' مطلوب کو وجود میں لانے اور معیار کو واقعہ بنانے کی جدوجہد اتمام کو پہنچ گئی۔

اس کے متضمنات یہ تھے کہ:

۱۔ ایک طرف فعال جماعت (حزب اللہ) تھی۔

۲۔ دوسری طرف مقصود اور حصول مقصد کی جدوجہد میں حزب الشیطان کی طرف سے مزاحمت تھی۔

۳۔ فعال جماعت کی طرف سے اس مزاحمت کی مزاحمت تھی۔ لہٰذا مقصود حاصل ہو کر رہا۔

تخلیق نتائج کے ضامن قوانین

۱۔ کائناتی قانون نشوونما

۲۔ تاریخی قانون تضاد

۳۔ اخلاقی قانون سعادت و شقاوت سے اس جدوجہد کے نتائج کا اتمام کو پہنچنا واضح ہوگیا۔

بالقوۃ فطرت اور بالفعل فطرت کی ثنویت اور ان کے درمیان تضاد کی صورت میں زوال سیرت لابدی تھا اور تجدید کی جدوجہد ناگزیر تھی۔ نگہداری اور جدوجہد سے فضائل کی تجدید ہوتی رہی اور معیار کم و بیش برقرار رہا۔

پہلے نگہداری اور پھر جدوجہد میں کوتاہی کے بقدر زندگی زوال سے دوچار ہوتی رہی۔

آج ہم اپنی غفلت سے زوال کی تجربی توثیق و شہادت سے اسی طرح گزر رہے ہیں جس طرح موثرات کمال کے تجربے سے گزرے تھے۔ لہٰذا موجودہ حالات سے نکلنے کے لئے اس تجربی توثیق کو دہرانا ضروری ہوگا جس سے گزر کر پہلے کامیابی ہوئی تھی۔ اس کے لئے ایمان بالغیب ضروری ہے۔ ایمان بالغیب کی اساس نظام تکوین میں مضمرہ کائناتی قوانین ہیں جو ناقابل تغیر اور ناقابل شکست ہیں۔ جن کی بدولت دورِ گزشتہ کی جاہلیت پر غلبہ حاصل ہوا تھا۔

ہرچند کہ دورِ جدید کی جاہلیت میں بعثت طیبہ سے پہلے کی جاہلیت کے تمام خواص پیدا ہوچکے ہیں یعنی ذہن زندگی اور کائنات کو بے مقصد سمجھنے کا غماز ہے۔ حصول مقصد میں کامیابی پر ایمان بالغیب مفقود ہے۔ اخلاقی پہلو میں بے انقیادی اور بے انضباطی غالب ہے۔ معاشرتی پہلو میں اخوت کی جگہ خودپسندی اور نسلی تفاخر نے لے لی۔ معاشی پہلو میں حرص، لالچ اور بخل اور سیاسی پہلو میں ہوس اقتدار غالب ہے۔ بین الاقوامی زندگی عداوت و عناد اور جنگ درجنگ کی مظہر ہے جس کے نتیجے

میں امن و عافیت اور سکون و طمانیت نابود ہے۔ چارہ جوئی جن کے ذمے ہے وہ مغلوب و مقہور ہیں۔۔۔۔ مگر ایک فرق جو دونوں جاہلیتوں کے درمیان ہے' وہ یہ ہے کہ قدیم جاہلیت میں رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید موجود نہ تھا اور اب قرآن موجود ہے۔ اسی جاہلیت کے علاج کے لئے خاتم الرسل علیہ التسلیم والتحیۃ نے تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ 'كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِي ﴿حدیث﴾

فرما کر خاتم الامم کو زوال میں مبتلا ہو جانے کی صورت میں اپنی اصلاح کی طرف متوجہ فرمایا تھا کیونکہ اس آیت پاک میں:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوا تَعْلَمُوْنَ ط

﴿البقرۃ:۱۵۱﴾

رسالت کا وظیفہ بیان کیا گیا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے تھا کہ:

تلاوت کیا ہے؟

اس کے جواب میں تضاد کیوں ابھرتا ہے؟

اس کا مداوا کیا ہے؟

تزکیہ کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟

الکتب کیا ہے؟

حکمۃ کیا ہے؟ اور

مَالَمْ تَكُوْنُوا تَعْلَمُوْنَ ط کیا ہے؟

مگر ہم کتاب اور اس کے عین مطابق عمل کے نمونہ کمال (سنت) کی پیروی کرکے زوال سے اس لئے نہ نکل سکے کہ ہم نے کتاب کو صحف ماسبق کی تمثیل پر

قیاس کر کے اسے بحوالہ لغت اوامرونواہی کا لکھا ہوا ضابطہ تو سمجھا لیکن امم سابقہ اور خاتم الامم کتب ماسبق اور خاتم الوحی کے مابین امتیاز پیش نظر نہ رہ سکا۔ فرق یہ ہے کہ جب تک گزشتہ امتیں وجود میں آتی رہیں' ان کے باقی رہنے کے لئے اقدارِ حیات کی حفاظت کی تدبیر اوامرونواہی کے لکھے ہوئے ضابطے کی صورت میں مہیا کی جاتی رہی۔ جس کی پیروی سے وہ اپنی اقدارِ حیات کی حفاظت کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھتی رہیں اور اس کی خلاف ورزی سے زوال میں مبتلا ہوتی رہیں جس سے نکالنے کا انتظار ہر زوال کے بعد نئی بعثت سے ہوتا رہا۔ انبیا کی قیادت میں کائناتی قوانین (قانون نشوونما' تاریخی قانون اور قانون سعادت و شقاوت) کے تحت امتیں زوال پذیر ہو کر بھی دوبارہ عروج حاصل کرتی رہیں اور نازل ہونے والے صحیفوں سے جو ضابطے میسر آئے' ان کی پیروی نے انہیں زوال سے محفوظ رکھا اور ان کی خلاف ورزی نے زوال میں مبتلا کیا ----- اور ہر زوال کے بعد نئی بعثت زوال سے نکالتی رہی۔

صحف ماسبق اور خاتم الوحی (قرآن) میں مماثلت تو اوامر و نواہی پر مشتمل ضابطہ ہونے کی تھی جو ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہی' لیکن جس خصوصی امتیاز نے قرآن کو خاتم الوحی بنا کر انسانیت کو نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز کیا' اسے ہم ملحوظ نہ رکھ سکے۔ یہ کائناتی قوانین کی تشکیل کی خاصیت کی توضیح اور ان کے وظیفے کی ترجمانی کے حاصل ہونے کی بناء پر قرآن کا صحف ماسبق سے متمیز ہونا تھا' اسی نے اسے خاتم الوحی اور متمم ہدایت بنایا۔ پرانے صحیفے ہدایت ضرور تھے' لیکن نئی بعثت کے امکان کی بناء پر کوئی صحیفہ متمم ہدایت نہ تھا۔ اس کے ذریعہ اپنی پیغمبرانہ قیادت کے ساتھ ہر دین اپنی ذات میں ویسا ہی کامل تھا جیسا خاتم الوحی سے میسر آنے والا دین۔ نزول قرآن سے جو تکمیل دین ہوتی ہے وہ نوع انسانی کو نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز

کرنے کی تکمیل ہے جس کا نتیجہ "ختم نبوت" ہے۔

قرآن مجید کی جو خصوصیت اسے خاتم الوحی بناتی ہے وہ ہمارے پیش نظر اس لئے نہ رہ سکی کہ ہم نے اسے کتاب بہشتی اوامر ونواہی کے لکھے ہوئے ضابطے سے زیادہ نہ سمجھا۔ اس لئے ہم زوال پذیر ہو جانے کے بعد مسلسل قیادت اور فکر میں خلا محسوس کر کے نئی قیادت کے مبعوث ہونے کی احتیاج کی شعور سے آزاد نہ ہو سکے۔ اسی لئے ایک طرف تو ہم مدعیان نبوت کو اس خلا کے پُر کرنے کی دعوت دیتے رہے اور دوسری طرف اپنی اپنی تعبیر اور اپنی اپنی قیادت سے فکر اور قیادت کے خلا کو پر کر کے "فرق بین الفرق" کو شدید تر کرتے رہے جس سے نوبت یہ آ پہنچی کہ مردہ ,بعد الطبیعیات پر مشتمل بے جان عقائد' مردہ رسوم' فرقہ پرستانہ آرزوؤں' مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ راہ حق پرستی تصور کر کے اور متحد ہونے کی ہر کوشش کو کفر جان کر فرقہ پرستانہ منافرت کے اظہار کو دینی حمیت کا تقاضا سمجھ رہے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

اگر ہم پندرھویں صدی کا آغاز اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کی نسبت امید و یقین اور خوداعتمادی سے کرنا چاہتے ہیں تو فرقہ پرستی کے بجائے قرآن مجید کے حجتہ من بعد الرسل ہونے کا اعتماد بحال کرنا ہوگا۔ اس کی شرط یہ ہے کہ ہم مطالعہ قرآن کا ایک ایسا منہاج فراہم کریں جو علم بالوحی سے نمونہ علم میں یکسانی کی ضمانت مہیا کرے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ
اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (المائدہ ۵: ۱۵-۱۶)

مقدمہ

ہماری زندگی میں قرآنی ہدایت کی احتیاج

فطرت انسانی میں گوناگوں تضادات

فطرت انسانی پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس میں گوناگوں تضادات موجود ہیں۔ ایک طرف اس کے جبلی داعیات ہیں' دوسری طرف ان داعیئے کے مقاصد ہیں' مثلاً بھوک کا تقاضا انسان میں جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد جسم کا تغذیہ ہے۔ مگر کھانے کی خواہش تغذیہ کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور بہت ہی غیر متناسب انداز میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل اور اپنے تخیل کی رو سے اچھے کھانے کی لذت کے تصور سے اپنے اندر غیر ضروری طور پر اچھے کھانے کی خواہش پیدا کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کے مختلف داعیات بیک وقت بیدار ہو کر اپنی اپنی طلب میں ایک دوسرے کے خلاف جا سکتے ہیں۔ مثلاً اس کے داعیہ ابوت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بچوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے اور اس کے داعیہ تحکم کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے' یہ دونوں تقاضے بیک وقت بیدار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جا سکتے ہیں۔

صرف یہی نہیں' بلکہ جبلی داعیات اور اخلاقی حس کے درمیان بھی تضاد واقع ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کا جنگ جوئی کا داعیہ اسے لڑنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کا صلح جوئی کا اخلاقی فرض اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ امن کو برقرار رکھا جائے اور تخریبی سرگرمی سے احتراز کیا جائے۔ یہ دونوں تقاضے بیک وقت بیدار ہو کر ایک

دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور انسان کو کشمکش میں مبتلا کرسکتے ہیں۔

تضادات کی صرف یہی تین قسمیں نہیں بلکہ عقلی سطح پر بھی انسان کے مختلف تضادات ایک دوسرے کے خلاف جاسکتے ہیں یعنی شعورِ علمی، شعورِ اخلاقی، شعورِ جمالی اور شعورِ مذہبی کے مطالبات ایک دوسرے کے ساتھ اس حد تک متصادم ہوسکتے ہیں کہ ایک مطالبہ غالب آکر شعور کے باقی پہلوؤں کے مطالبات کی نفی کر دے۔ مثلاً شعورِ علمی کی طلب زندگی کے اخلاقی و عمرانی فرائض سے غافل کر دینے کی حد تک شدید ہوسکتی ہے اور شعورِ جمالی کی یہ طلب کہ جمالیاتی سرور میں دوام و استمرار پیدا ہو، انسان کو اخلاقی فرائض سے بے پروائی کی حد تک لے جاکر شعورِ جمالی اور شعورِ اخلاقی کے تقاضوں میں تضاد پیدا کرنے کا موجب ہوسکتی ہے۔

انسان کے بنیادی صورِ شعور میں سے ہر ایک میں ایک نصب العین مضمر ہے اور اس کی استعداد کی کمی حصول نصب العین میں رکاوٹ ہے۔ مثلاً انسان کا شعورِ علمی علم کے نصب العین کو حاصل کرنے پر مصر ہے۔ وہ نصب العین یہ ہے کہ پوری کائنات، مع اپنی تمام کثرت کے جو اس میں پائی جاتی ہے، کسی اصول واحد کے تحت اس انداز سے منظم ہو ---------- کہ ساری کثرت اس اصول واحد سے منطقی طور پر منتزع ہوئی ہے مگر جو مشکل اس نصب العین کے حصول میں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کے منطقی انتزاع کے طور پر جو نظام وضع ہوگا وہ تصورات عقلی کا نظام ہوگا جس میں معقول فی الذہن اور موجود فی الخارج کا امتیاز ختم نہیں ہوگا اور محسوس اور معقول کے درمیان جو خلیج ہے وہ پاٹی نہیں جاسکے گی۔ امتیاز کو نظرانداز کردینا اور بات ہے۔

انسان کے شعورِ اخلاقی میں جو نصب العین مضمر ہے وہ یہ ہے کہ پوری کائنات ایک ایسے اخلاقی نظام میں تبدیل ہوجائے جس میں کسی نیک آدمی کو ناکامی نہ

ہوسکے۔

اور کوئی بدی کامیاب نہ ہوسکے۔ ہر شخص کو اس کی نیکی کے بقدر مسرت حاصل رہے اور ہر برا آدمی اپنی بدی کے بقدر تکلیف میں مبتلا رہے۔ فطرت انسانی میں خواہش اور فرض کا تضاد اور انسان کا اپنے ارادے میں صاحب اختیار ہونا اس کے راستے میں رکاوٹ ہے کیونکہ انسان کا اپنے ارادے میں مختار ہونا' جو اس کا کمال ہے' وہی اس کا نقص بن گیا ہے' اس کے باوجود حصول نصب العین کی آرزو سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔

انسان کے شعورِ جمالی میں جو نصب العین مضمر ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن جمال سے آراستہ ہو جائے اور اس کا پورا ماحول مجموعی طور پر اس کا ایک ایک جز فرداً فرداً حسن و جمال سے مزین ہو جائے۔ مگر اس کی شخصیت کے تہ در تہ پہلوؤں میں پوشیدہ مکروہات ایک طرف اور اس کے ماحول کی وسعت اور اس کے مختلف اور متنوع پہلوؤں میں نمایاں نقش بدروئی اور قبیح منظری' دوسری طرف اس کی عمر طبیعی کے مختصر وقفے میں جمالیاتی نمونہ کمال بننے میں مستقل مزاحمت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس نصب العین کے حاصل ہونے کی آرزو سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

انسان کے مذہبی شعور میں جس نصب العین کی طلب پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی دعائیں قبول ہوں' اس کی فطرت راضی برضائے الٰہی کے نمونے پر ڈھل جائے۔ اس کی روح عبدیت تامہ کے مقام پر فائز ہو جائے۔ اس کی پوری زندگی حقیقت حقہ کے قرب اور اس کی حضوری کے دائمی شعور میں بسر ہو' مگر اس کے نفس کی سرکشی' اس کا تلون' اس کی انا' اس کے علائق دنیاوی' اس کے عزم کی کمی' اس کی راہ میں سد سکندری بن کر کھڑے ہیں۔ پھر بھی وہ ترک طلب پر آمادہ نہیں

ہو سکتا۔

ان سب فطرتی داعیات' ان تمام عقلی غایات اور صورِ شعور میں مضمران تمام مطمحِ ہائے نظر کے پانے کی آرزو اور ان آرزوؤں کی تکمیل میں مزاحمتوں کے ہوتے ہوئے' ہر آرزو مختلف افراد میں اپنے ماحول کے زیرِ اثر مختلف انداز سے نشوونما پاتی ہے۔ نتیجۃً ہر فرد اپنی جگہ ایک خاص نمونے پر ڈھل گیا ہے۔ اسی لئے عام مشاہدہ ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد ایک ایسا واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

یہ تضاد افراد تک ہی محدود نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے درمیان بھی بطور واقعہ پایا جاتا ہے۔ اسی لئے دورِ جدید کے تحلیلِ نفسی کے ماہرین میں سے ایک کا خیال یہ ہے کہ معاشرہ فرد کے لئے ایک چیلنج ہے اور دوسرے کے نزدیک فرد معاشرے کے لئے ایک چیلنج ہے۔

صرف یہی نہیں' بلکہ ایک معاشرہ' دوسرے معاشرے کے لئے' ایک قوم دوسری قوم کے لئے' ایک ریاست دوسری ریاست کے لئے' ایک تہذیب دوسری تہذیب کے لئے ایک چیلنج ہے۔ یہ تضاد اس درجہ مسلم ہے کہ دورِ جدید کے ایک سیاسی مفکر نے ریاست کی تعریف یوں کی ہے کہ:

> "ریاست وہ ہیئت اجتماعی ہے جسے اپنی بقا اور توسیع کے لئے دوسری ریاستوں سے صلح اور جنگ کرنے کا اختیار حاصل ہو۔"

اس تضاد اور کش مکش کے باوجود انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت اور طلب کی مناسبت سے کمال پر فائز ہو۔

زوال کے بعد پیدا ہونے والے نوع بنوع مسائل

امت مسلمہ کے زوال سے دوچار ہونے کے بعد نوع بنوع مسائل پیدا ہوئے جنہیں حل کرنے کے اعتماد سے ہم محروم ہیں۔

اپنی شدت طلب میں انسان جن اہم ترین سوالات سے دوچار ہے وہ یہ ہیں:

- اس کی فطرت میں ضبط وانقیاد کیسے پیدا ہو؟
- اس کی علم حقیقت کی طلب کیسے پوری ہو؟
- وہ کمال اخلاق پر کیسے فائز ہو؟
- اس کا ماحول ایک اخلاقی نظام میں کیسے تبدیل ہو؟
- اس کی جمالیاتی طلب کیسے پوری ہو؟
- اس کی جمالیاتی طلب کو دوام اور استمرار کیسے میسر آئے؟
- اس کا ماحول ایک جمالیاتی شاہکار کیسے بن جائے؟
- اس کے شعورِ مذہبی میں مضمر اجابت کی تمنا کیونکر پوری ہو؟
- اسے اللہ سے ہم کلامی کیسے میسر آئے؟
- اسے خدا کی حضوری کے شعور میں دوام و استمرار کیونکر حاصل ہو؟
- افراد کے درمیان کش مکش سے نجات کیسے ملے؟
- فرد معاشرے کی مضرت سے اور معاشرہ فرد کی آزار رسانی سے کیسے محفوظ ہو؟
- قوموں کی عداوت' ریاستوں کے عناد اور تہذیبوں کی معاندانہ کش مکش کا تدارک کیسے کیا جائے؟

اس گوناگوں تضاد اور کش مکش اور اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کے ہوتے ہوئے انسان کی کامیابی اور اس کے حصول کمال کی کچھ شرائط ہیں:

۱۔ وہ حصول کمال کی جدوجہد کرنے کے لئے صاحب اختیار ہو' یعنی ان غایات کو پانے کی سعی میں اس کا ارادہ ہر اندرونی اور بیرونی موثر سے آزاد ہو اور وہ اپنے عمل کو خود متعین کرسکے۔

۲۔ اگر وہ اپنے ارادے میں صاحب اختیار ہو تو بھی اس کی کامیابی متصور نہیں ہوسکتی کیونکہ عمر طبیعی کے محدود وقفے میں ان موانع اور مزاحمتوں کے ہوتے ہوئے جو اس کے راستے میں حائل ہیں' ایسے عظیم الشان مقاصد کے حصول کی جدوجہد نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان نہ صرف اپنے ارادے میں مختار ہو بلکہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہونی چاہیے تا کہ ان غایات کو پانے کی جدوجہد اتمام کو پہنچ سکے۔ لہٰذا حیات بعدالموت بھی انسان کے کامیاب ہونے کی ایک اور ضروری شرط ہے۔

۳۔ لیکن اگر انسان اپنے ارادے میں مختار ہو اور مرنے کے بعد بھی زندگی ہو تو بھی انسان کا اپنی غایات کو پالینا متصور نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری یہ ہے کہ کائنات اپنی ساخت میں انسان کی کامیابی سے سازگار ہو بلکہ سازگاری کے اصول پر پیدا کی گئی ہو۔

۴۔ مگر جو تضاد انسان کو اپنی غایات کے حصول اور اس کائنات کے بظاہر ناسازگار ہونے کے انداز میں نظر آتا ہے اس کے پیش نظر اس کی کامیابی

قرین قیاس نہیں۔ اس صورت میں روح انسانی کی گہرائی سے ایک پکار اٹھتی ہے کہ "کاش! خدا ہوتا جو اس کی مدد فرماتا۔"

۵۔ مگر انسان کے حواس' اس کی عقل اس کا گمان' اس کا قیاس' اس کا وجدان' غرض انسان کی کوئی استعداد حتمی' قطعی اور یقینی طور پر خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔

اب انسان کے فائزالمرام ہونے کی شرط صرف یہ ٹھہری کہ خدا اپنے ہونے کا اپنی صفات کا' اپنی مدد کا' اپنی ہدایت کا اور اپنے فضل کا یقین انسان کو خود دلا دے۔

اس کی صورت وحی اور رسالت ہے لہٰذا وہ ہدایت جو بذریعہ وحی اور بوسیلہ رسالت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہونا چاہیے کہ نظام کائنات بے مقصد نہیں اس کا ایک مقصد ہے۔ اور کائنات اس مقصد کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی سے سازگاری کے اصول پر پیدا کی گئی ہے۔ مقصد کے حصول کی جدوجہد میں کیا ضبط انقیاد اپنے اوپر لازم کرنا ہوگا کیونکہ ضبط و انقیاد ایک ذریعہ ہے جو حصول مقصد کے لئے ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق اور معیارِ اخلاق کا علم وحی قرآنی سے حاصل ہونے کے بعد' سیرت و کردار کی نشوونما میں فطری موانع کو دور کرنے کے لئے تزکیہ ضروری ہوگا اور معیار کے نمونے پر زندگی کو ڈھالنے کے لئے نفسیاتی محرک مہیا کرنا ضروری ہوگا جس کی وضاحت لائحہ عمل کی بحث میں آئے گی۔

اخلاقی کمال پر فائز ہونے اور اس اخلاقی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ یہ عالم بالفعل ایک اخلاقی نظام میں تبدیل ہو جائے تا کہ غایت نزول وحی اور غایت بعثت کے مابین تعلق کو قرآنی وحی کے حوالے سے سمجھا جا سکے۔

انسان کی جمالیاتی طلب کے پورا ہونے اور اس کی جمالیاتی مسرت میں دوام و استمرار میسر آنے اور انسان کے پورے ماحول کے ایک جمالیاتی شاہکار بن جانے کو جنت کے حوالے سے سمجھنا درکار ہے اور یہ کہ جنت کیا ہے اور کیسے حاصل ہوگی؟ اس کی وضاحت تصورِ عالم اور لائحہ عمل کے ضمن میں کی جائے گی۔

اس کے مذہبی شعور میں مضمر ونا کا پورا ہونا' اسے اللہ سے ہم کلامی میسر آنا اور اسے اللہ تعالیٰ سے دائمی قرب کا شعور' اس اعلیٰ ترین نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے انعام کے طور پر عطا ہوگا جس کی نشاندہی تصورِ کائنات اور لائحہ عمل کی بحثوں میں کی جائے گی۔

فرد کو معاشرے کی مضرت اور معاشرے کو فرد کی ایذا رسانی سے محفوظ کرنے کے لئے قرآن مجید ایتائے حقوق پر معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح وہ تخریبی تضاد جو ایک محدود دائرے میں مطالبہ حقوق کی بنا پر پیدا ہوا تھا' یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں کو عداوت' ریاستوں کے عناد اور تہذیبوں کی معاندانہ کش مکش سے نجات پانے کے لئے دین کا غلبہ ضروری ہے جو خاتم الرسل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت کا مقصود ہے اس لئے ضروری ہے کہ کائناتی سطح پر نتائج تضاد کے جس قانون سے [illegible] ہوتے ہیں' اس کا علم حاصل ہو کیونکہ یہی قانون تاریخی سطح پر نتائج پیدا کرتا ہے۔ مقصد کے حصول کی خاطر جدوجہد میں تنظیم' استقامت اور قربانی سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مقصد حاصل ہو کر رہتا ہے اور غلبہ و استیلا میسر آتا ہے۔

شرط یہ بھی ہے کہ ہمیں اس کا یقین حاصل ہو کہ مفاد پرستانہ تمناؤں' بے نظمی' عدم استقامت (بے صبری) اور خود غرضی سے زوال ہوتا ہے۔

ہمیں حق کے غلبے اور باطل کی شکست کا یقین حاصل ہو۔

بدلتے رہنے والے حالات میں خدا کے قانون کے اٹل ہونے کا یقین ہمیں میسر آئے۔

یہ اعتماد حاصل ہو کہ قرآنی ہدایت ارادی جدوجہد سے' بعثت کی غایت تک پہنچانے کی کفیل اور حصول غایت کی ضامن ہے۔

وحی کے ذریعے میسر آنے والی ہدایت ایسی ہونی چاہیے جو پیغمبرانہ رہنمائی قبول کرنے والوں کو اپنے اپنے تاریخی ادوار میں تاریکیوں اور ٹھوکروں کی زندگی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے قابل بنا دے۔

یہ ہدایت ان تمام کائناتی قوانین' تاریخی تجربات' علمی تحقیقات اور زندگی کی ن تمام ساختوں کو جانتے ہوئے جن کے بغیر ارتقاء کا امکان پیدا نہیں ہوتا' ہمیں یہ بات سمجھا دے کہ جب ہم اسلام کے بہترین نظام حیات ہونے کے قائل ہیں اور تکمیل دین کا نعرہ لگاتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ہماری مختلف تنظیمات اور جماعتوں کے ہنگامی غلبے' جوش اور ولولے شعلہ مستعجل ثابت ہوئے۔

اس ہدایت سے ہماری تحریکوں کی ناپائیداری کا سبب واضح ہو جائے۔

ہماری مساعی میں استقامت اور استمرار میسر آئے۔

انسانی بغاوت کے باوجود مادی زندگی میں خدا کے غالب ہونے کا یقین پیدا ہو۔

پیغمبرانہ جدوجہد کے حتماً نتیجہ خیز ہونے کا یقین حاصل ہو۔

ہمارے ماضی میں حق کے غلبے اور باطل کی فیصلہ کن شکست کے یقین کی اساس ہماری سمجھ میں آسکے۔

ہم یہ سمجھ لیں کہ پچھلی تاریخ اہل بدعت کا غلبہ دکھاتے رہنے کے باوجود مسلمانوں کو لاشعوری طور پر کامیابی کا یقین کیسے دلاتی رہی۔ اور یقین رکھنے والوں کو

کس طرح سرگرم عمل رکھتی رہی۔

ہمارے پاس وہی قرآن موجود ہے جس کی رہنمائی نے بعثت سے لے کر حجتہ الوداع تک وہ تمام نتائج پیدا کر کے دکھا دیئے جن کا دعویٰ قرآن میں کیا گیا تھا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے مگر آج قرآن سے ان مسائل کو حل کرنے میں جو موانع ہیں وہ یہ ہیں کہ:

- "کتاب کا مفہوم قرآن کے بجائے لغت سے متعین کیا جا رہا ہے۔
- قرآن کو صحف ماسبق پر قیاس کر کے اسے صرف قانون سازی کا ایک ماخذ تصور کیا جا رہا ہے۔
- قانون سازی میں رہنمائی کے علاوہ قرآن سے اور کوئی تمنا نہیں کی جا رہی۔
- موثرات حیات کے بدل جانے پر قانون سازی کے علاوہ اصلاح کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جا رہا۔
- قرآن کا حرف حرف اور زیر زبر محفوظ ہونے کے باوجود انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی کا احساس ختم نہیں ہو رہا۔
- اساسات ایمان سے صرف نظر ہو گیا ہے۔
- کتاب و سنت اور تاریخ اسلام کے تصورات مسخ ہو گئے ہیں۔
- شکست خوردگی کے تجربات سے گزرنے کے باعث بے یقینی غالب ہے۔
- شکست کی توجیہ اللہ کی بے نیازی سے کی جا رہی ہے۔
- قرآن اپنی جس خصوصیت کی بنا پر دورِ مابعد رسالت میں حجت ہے اس

سے توجہ ہٹ گئی ہے۔

⇦ دورِ رسالت کی جدوجہد میں کامیابی کو کتاب و سنت کی پیروی کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے اسے پیغمبرانہ قیادت کے معجزے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

اگر ہم نے علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان، حق و باطل کے قرآنی مفہوم اور فقہی مفہوم کے درمیان "کتاب" کے قرآنی اور لغوی مفہوم کے درمیان قرآن اور صحف ماسبق کے درمیان، توحید و عبادت اور رسالت و اطاعت کے درمیان زوال کی قرآنی توجیہ اور خودساختہ توجیہ کے درمیان، تکمیل دین کے قرآنی مفہوم ور خودساختہ مفہوم کے درمیان، قرآنی اساس اجتماعیت اور خودساختہ اساس اجتماعیت کے درمیان، امتیاز کو ملحوظ رکھا ہوتا تو اسوۂ کامل کی پیروی کے ذریعے کامیابی کے اعتماد سے محروم نہ ہوئے ہوتے۔

اس صورت حال کا اب صرف ایک ہی علاج ہے کہ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم لغت کے بجائے آیات قرآنی سے اخذ کریں اور قرآن مجید نے اپنے بارے میں جو دعاوی کئے ہیں ان کے برحق ہونے پر اپنا اعتماد بحال کرنے کے لئے اور قرآنی وحی کے عطا کردہ علم سے یکسانی کا نمونہ پیدا کرنے کے لئے ایک ایسا منہاج متعین کریں جس کی ضرورت اب تک اس لئے محسوس نہیں کی گئی کہ تفسیر، جو انسانی استعداد کا زائیدہ علم ہے، علم بالوحی کا بدل بن گیا ہے۔

انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے منہاجات

فلسفیانہ فکر کی نشوونما دو ادوار پر مشتمل ہے:

(الف) ماقبل تنقید دور جس میں دو مرحلے ہیں:

۱۔ عقلیت (Rationalism) اور

۲۔ حسیت (Empricism)

(ب) دورِ تنقید (Era Of Criticism) عقلیت' حسیت اور تنقید تینوں منہاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ منہاج مسائل کو حل کرنے کا طریقہ ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے۔

بنیادی اصول

اس اصول کے مطابق مسئلے کو حل کرنے کا عمل

عقلیت:

عقلیت کا اصول یہ ہے کہ عقل نظری اور خالصتاً عقل نظری ہی ذریعہ علم حقیقت ہے۔ یہ اصول عقل نظری کے ذریعہ علم حقیقت ہونے کے باب میں لامحدود یقین کا موقف ہے چونکہ عقل صرف معقولات کا ادراک کرسکتی ہے اور معقول (Rational) ہی ہے۔ اس لئے کلی (Universal) حقیقت ہے۔ جزئی (Particular) حقیقت نہیں۔ کلی ذہنی (Conceptual) ہے اس لئے ذہنی حقیقت ہے۔ موجود فی الخارج (Existential) حقیقت نہیں۔ ذہنی زمان و مکان سے ماورا یعنی قدیم ہے اس لئے قدیم (Eternal) حقیقت ہے حادث (زمانی و مکانی) حقیقت نہیں۔ ذہنی بسیط (Abstract) ہے۔ اس لئے بسیط حقیقت ہے۔ مرکب (Concrete) حقیقت نہیں۔ بسیط مطلق (Absolute) ہے اس لئے مطلق حقیقت ہے اضافی (Relating) حقیقت نہیں۔ مطلق واجب (Necessary) ہے اس لئے واجب حقیقت ہے ممکن (Contigent) حقیقت نہیں۔

عقلیت کی رُو سے قضیہ تحلیلیہ (Analytical Judgment) علم ہے جیسے تمام اجسام متحیز (Extended) ہیں۔ اب جسم اور تحیز (طول' عرض' عمق)

ایک ہی ہیں۔ قضیہ تحلیلیہ محکوم (Subject) کے بارے میں محکوم بہ (Predicate) سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتا اور نہ یہ وثوق پیدا ہوتا ہے کہ اس قضیے کے متوازی خارج میں کوئی حقیقت ---- جیسی قضیے میں بیان ہوئی ہے ----- موجود بھی ہے یا نہیں۔

جب عقلیت کے منہاج نے متضاد نتائج پر پہنچایا جیسے ڈیکارٹ (Descartes) نے ثنویت (Dualism) پر' اسپنوزا (Spinoza) نے وحدتیت (Monism) پر اور لائبنیز (Leibntiz) نے روحانی سالمات (Monads) کی کثرتیت (Pluralism) پر' تو عقل کے ذریعہ علم حقیقت کے بارے میں لامحدود یقین لامحدود بے یقینی میں بدل گیا اور فکر انسانی حسیت کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔

حسیت

حسیت کا اصول یہ تھا کہ عقل نہیں' حواس اور فقط حواس ہی ذریعہ علم حقیقت ہیں اور اس اصول کے تحت قضیہ مرکبہ (Synthetic Judgement) علم متصور ہوا۔ مگر قضیہ مرکبہ کی معذوری یہ ہے کہ اس میں کلیت اور وجوب متصور نہیں ہوتے۔ اس لئے علم یقینی ناممکن ہو جاتا ہے۔

جب اس منہاج کی رو سے لاک (Lock) نے مادیت تک پہنچایا اور برکلے (Berkeley) نے مادہ کی نفی کرکے اسے ذہن (Mind) کی اولین اور ثانوی کیفیات سے تعبیر کیا اور ہیوم (Hume) نے ذہن کے جوہر ہونے کا انکار کرکے اسے کیفیات نفسی سے تعبیر کیا اور علم یقینی تک رسائی ناممکن متصور ہوئی تو انسانی فکر تشکیک کا شکار ہو گیا۔

تنقید

چونکہ انسان تادیر تشکیک کا شکار نہیں رہ سکتا اور زندگی کے لئے فکری اساس مہیا کرنا ازبس ضروری ہے' اس لئے تنقید کی منہاج سے کانٹ (Kant) کی بدولت فلسفے میں ایک انقلاب آیا۔ وہ یہ تھا کہ ماقبل تنقید دور کے عقلیتی اور حسیتی دونوں مرحلوں میں غوروفکر کی ابتدا منظور کی جانب سے ہو رہی تھی اور مسئلہ یہ تھا کہ یہ کائنات کیا ہے؟ اس میں انسان کا مقام و منصب کیا ہے؟ اور اس مقام و منصب کے پیش نظر اس کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ تنقید کے مرحلے پر جستجو کی ابتدا منظور (Object) یعنی کائنات کے بجائے ناظر (Subject) یعنی انسان کی جانب سے کی گئی اور مسئلے نے یہ صورت اختیار کرلی کہ میں کیا ہوں؟ انسانی انا ایک بامقصد عملیت ہے' جسے ان غایات کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جن کی یہ طلب گار ہے۔ یہ کائنات' جو انسان کو گھیرے ہوئے ہے' اس کی طرف وہ مختلف قسم کی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے' جنہیں صورِ شعور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک شعور' شعورِ علمی ہے' جس کا مسئلہ یہ ہے کہ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ اور طے پایا کہ قضیہ مرکبہ وھبیہ (Synthetic Judgment A Priori) ہی علم ہے یعنی علم ایک ایسے وجوبی اور کلی قضیے کا نام ہے جس کے متوازی خارج میں حقیقت ویسی ہی موجود ہو جیسی قضیہ علمی میں بیان ہوئی ہے--- اور ایسا قضیہ تب ہی مرتب ہو سکتا ہے جب ایک طرف ناظر ہو' جو عالم کہلائے گا اور دوسری طرف منظور ہو' جو معلوم کہلائے گا۔ پھر ناظر میں علم کی استعداد ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعدادِ علم سے معلوم بن سکے۔ انسانی علم کی دو استعدادیں ہیں۔ ایک حواس' دوسری عقل' جو ملکر ایک ذریعہ

علم بنتی ہیں۔ حواس سے علم کا خام مواد میسر آتا ہے اور عقل اس مواد کو اپنے بنیادی تصورات یعنی مقولات (Categories) کے تحت منظم کر کے قضیہ علمیہ مرتب کرتی ہے۔ حواس سے یہ وثوق حاصل ہوتا ہے کہ معلوم خارج میں وجود رکھتا ہے اور عقل سے قضیہ علمیہ میں وجوب اور کلیت کے خصائص پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح سائنس، حقیقت کے بعض پہلوؤں کا علم یقینی تو متصور ہو سکتا ہے، مگر جب ہم "حقیقت من حیث الکل" یعنی کائنات کو اس کے طول، عرض، عمق، ابتداء، انتہاء مقصد اور منتہائے حقیقت کے اعتبار سے سمجھنا چاہتے ہیں تو تنقیدی منہاج اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ حقیقت من حیث الکل کے بارے میں ایسا قضیہ جو وجوبی اور کلی ہو اور اس کے متوازی خارج میں بھی حقیقت ویسی ہی ہو جیسی قضیے میں بیان ہوئی ہے، اس لئے مرتب نہیں ہو سکتا کہ پوری کائنات ہمارے حواس کا ناقابل انکار منظور نہیں بن سکتی اور جو قضیہ حواس کی مدد کے بغیر مرتب ہو گا اس کی نسبت یہ وثوق نہیں ہو سکتا کہ اس قضیے کے متوازی حقیقت ہے بھی یا نہیں ---- یعنی حواس کے بغیر اس قضیے کی صحت کا یقین نہیں ہو سکتا اور عقل کے بغیر اس میں وجوب اور کلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مابعد الطبیعیات، یعنی کائنات من حیث الکل کے علم مدلل کا کوئی امکان نہیں ہے۔

پس عملی فلسفہ کی ابتدا ناظر کی جانب سے ہوئی اور مسئلے نے یہ شکل اختیار کی کہ انسان کے شعورِ اخلاقی، شعورِ جمالی اور شعورِ مذہبی میں مضمر نصب العین کیا ہیں اور وہ کیسے حاصل ہوں گے؟ تو انسان کی کامیابی کے شرائط یہ طے پائے کہ:

> "انسان اپنے ارادے میں صاحب اختیار ہو اور مرنے کے بعد زندگی ہو۔"

لیکن اگر انسان صاحب اختیار بھی ہو اور مرنے کے بعد اپنی جدوجہد کے

نتائج دیکھنے کے لئے زندگی بھی ہو' تو بھی جب تک کائنات اپنی ساخت میں انسان کی کامیابی سے ہم آہنگ نہ ہو' انسان کی کامیابی متصور نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات چونکہ بظاہر انسان کی کامیابی میں مزاحم نظر آتی ہے' لہٰذا اس کی کامیابی کی شرط یہ ہے کہ:

"خدا ہو' جو انسان کی مدد کرتا' اسے ہدایت دیتا اور اپنے فضل سے کامیابی سے سرفراز کرنا چاہیے۔"

لہٰذا فلسفہ عملی کی بنیاد ان شرائط پر رکھی گئی' مگر انسان کی عقل' اس کے حواس' اس کا وجدان' اس کا قیاس' اس کا گمان' غرض اس کی کوئی استعداد حتمی' قطعی اور یقینی طور پر خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ ان مسلمات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا' ان کی بنیاد پر ایک عمومی مابعدالطبیعیات کو تسلیم کرنا' اس لئے لازم آیا کہ انسان اپنی اخلاقی آرزوؤں اور روحانی تمناؤں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کی رو سے غایات عالیہ کے حصول کا صرف امکان متصور ہوتا ہے اور انسان کو کامیابی کی یقینی ضمانت درکار ہے۔

اس صورت حال میں روح انسانی کے اعماق سے ایک پکار اٹھتی ہے کہ کاش! خدا ہوتا جو اس کی مدد فرماتا۔ اب اس کی کامیابی کی صرف یہی شرط ہے کہ خدا اپنے ہونے کا' اپنی مدد کا' اپنی ہدایت کا' اپنے فضل کا یقین انسان کو خود دلا دے۔ اس کی صورت وحی اور رسالت ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○ (النساء: ۱۱۳)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری اور آپ ﷺ کو وہ علم سکھایا جو آپ بطورِ خود نہیں جان سکتے تھے۔ اور تم پر خدا کا

بڑا فضل ہے۔

اس کتاب (القرآن) اور اس کی پیروی کے عملی نظام (سنت) سے دورِ رسالت میں بعثت سے حجتہ الوداع تک وہ تمام دعوے جو اس کتاب میں کئے گئے تھے' ان کے نتائج قبل از مرگ زندگی میں اتمام کو پہنچ گئے۔ یعنی افراد اخلاقی اور روحانی کمال پر فائز ہوگئے۔ مثالی معاشرہ وجود میں آگیا اور غلبہ دین حق مسلم ہوگیا۔

لیکن موجودہ حالت یہ ہے کہ عالم اسلام اصولاً ایک وحدت (اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً) ہونے کے بجائے اختلال کا شکار ہو کر تینتالیس ریاستوں میں تقسیم ہوچکا ہے اور وہ سب اپنے دشمنوں کے مقابلے میں متحد نہ ہونے کی وجہ سے کالعدم ہو کر رہ گئی ہیں اور امن و عافیت اور سکون و طمانیت سے محروم ہیں۔

دورِ ملوکیت میں "دعوت و تبلیغ" کا جو نظام وضع کیا گیا تھا آج اس کی حیثیت عقائد کے باب میں مردہ مابعد الطبیعیات کی اور اعمال میں عبادات کی حیثیت رسوم و ظواہر کی اور معاملات میں ایسے قانون کی ہو کر رہ گئی ہیں جس کی خلاف ورزی ہی سے زندگی کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں۔

طریقت کے ذریعے تزکیے کی ضرورت تو احکام فقہ کے اتباع میں خلوص پیدا کرنے کے لئے تھی' اس لئے علما اور صوفیہ دونوں بے اثر ہوگئے۔ بے جان عقائد مردہ رسوم' فرقہ پرستانہ آرزوئیں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیاں پیغمبرانہ راہ حق پرستی متصور ہونے لگیں' جس کی رو سے متحد ہونا کفر اور فرقہ پرستانہ منافرت کا اظہار دینی حمیت کا تقاضا بن گیا۔

مطالعہ قرآن کا منہاج

حیات انسانی کی تین سطحیں ہیں:

انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی۔

اور ہر سطح پر ہدایت ہونے کی حیثیت سے اپنی نسبت قرآن کا دعویٰ ہے:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿مزمل:۱۹﴾

اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ ﴿زخرف:۴۴﴾

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴿یوسف:۱۰۴﴾

اس ہدایت کو زندگی کے تینوں پہلوؤں پر منطبق کرنے کے لئے مطالعہ قرآن کا ایسا منہاج ضروری ہے جو غایت نزول قرآن تک پہنچا سکے۔

قرآن مجید کا موقف یہ ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ ﴿المائدہ:۴۸﴾

"شرع" بصورت اوامر و نواہی وہ قانون ہے جس کے ذریعے ان اقدارِ حیات کا تحفظ مطلوب ہے جو دورِ رسالت میں پیدا ہوئی تھیں مگر "منہاج" (طریقہ) شرع سے پہلے ضروری ہے جس سے وہ اقدار وجود میں آئیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منہاج کیا ہے؟

منہاج کے دو اجزاء ہیں۔

۱۔ بنیادی اصول اور

۲۔ اس اصول کے تحت مسائل کو حل کرنے کا عمل

کیونکہ منہاج مسائل کو حل کرنے کے لئے درکار ہے۔

بنیادی اصول

بنیادی اصول یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح انسانیت کی آرزو مقدم ہے اور نزول قرآن مؤخر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے انقلابی اصلاحی مسائل کے جوابات کی حیثیت سے صحیفہ انقلاب کے طور پر نازل ہوا۔ لہٰذا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بھی قرآن ہی حرف آخر ہے۔

مسائل کے حل کرنے کا طریقہ

منہاج مسائل کے حل کرنے کا طریقہ ہے' جو چار مدارج پر مشتمل ہے:

۱۔ تمیز (Distinction)

اولین مرحلہ تمیز ہے جس کا وظیفہ یہ ہے کہ علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم--- جن کی حیثیت مماثل فضائل کی سی نظر آتی ہے--- کے درمیان امتیازات کو پیش نظر رکھا جائے۔

علم بالوحی اور انسانی علم کو "عمل" اور "علم" کے امتیازات کو سمجھے بغیر سمجھنا اس لئے ناممکن ہے کہ علم بالوحی عمل کا' یعنی نصب العین اور اس کے حصول کا ضامن لائحہ عمل کا علم ہے اور انسانی علم محسوسات کا علم ہے جس کی نشوونما کی تکمیل کا رخ ابھی تک اس وجہ سے متعین نہیں ہوسکا کہ اس کی نشوونما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی رہی ہے۔

۲۔ علم کا موضوع "حقیقت محسوس" ہے اور عمل کا "مقصود۔"

۳۔ علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے اور انتہا یقین پر۔ بخلاف اس کے عمل کی ابتدا ایمان سے ہوتی ہے اور انتہا رسوخ فی الایمان پر۔

۴۔ علم کا مسئلہ یہ ہے کہ "یہ کیا ہے؟" اور عمل کا مسئلہ ہے کہ "مقصود کیسے حاصل ہو؟"

۵۔ علم میں "ادراک بالحواس" اہم ہے اور عمل میں "ارادہ۔"

۶۔ علم کا بنیادی تصور "جبر" ہے اور عمل کا "اختیار"

۷۔ علم کا وظیفہ "توجیہ و تعلیل" ہے اور عمل کا "تخلیق نتائج۔"

۸۔ علم کے مضمرات یہ ہیں کہ:

(الف) ایک طرف ناظر ہو جو عالم کہلائے گا۔

(ب) دوسری طرف منظور ہو جو معلوم متصور ہو گا۔

(ج) ناظر میں جاننے کی استعداد ہو اور

(د) منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آسکے۔

بخلاف اس کے عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ:

(الف) ایک طرف فعال عامل ہو۔

(ب) دوسری طرف مقصود ہو۔

(ج) مقصود کے حاصل ہونے کی جدوجہد میں مزاحمت ہو اور

(د) فعال عامل کی طرف سے اس مزاحمت کی مزاحمت ہو تو مقصود حاصل ہو گا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ تمدنی علوم ---- علمیات' نفسیات' عمرانیات' اخلاقیات' معاشیات' سیاسیات' تاریخ' قانون ---- کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جو قرآنی وحی کی عطا کردہ ہیں اور

۲۔ دوسری وہ جو انسانی استعدادِ علم کی زائیدہ ہیں۔

علمیات

علمیات کا موضوع علم ہے اور اس کا مسئلہ یہ ہے کہ علم کیا ہے اور کیسے ہے؟

قرآنی علمیات کی رو سے سمع' بصر اور فواد علم کا ذریعہ ہیں۔ سمع کو بصر کے مقابلے میں اولیت اس لئے حاصل ہے کہ سمع کے ذریعے صاحب وحی کی سند پر ان حقائق کے بارے میں بھی یقین حاصل ہوتا ہے جن تک انسانی استعدادِ علم کی رسائی ممکن نہیں۔ علمیات کا ناقابل انکار مسلمہ عالم خارجی کا وجود ہے جس کا اعتراف اہل ایمان کے لئے ناگزیر ہے اور جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴿آلِ عمران:۱۹۱﴾

اگر یہ اعتراف نہ ہو تو نہ علم ممکن ہے نہ اخلاق نہ معاشرہ' نہ معیشت نہ سیاست اور نہ ان سب پہلوؤں کی اصلاح کے لئے پیغمبرانہ رہنمائی کی احتیاج باقی رہتی ہے۔

علم بالوحی میں نہ تو ارتقائی تدریج ہے نہ احتمال خطا۔ بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ علمیات ہر چند کہ علم ہی کے موضوع سے بحث کرتی ہے اور اس کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ مگر اس کے مسئلے کا حل معرض ارتقا میں ہے اور یہ ارتقا اقدام و خطا کے انداز میں ہوتا ہے۔ کبھی مبہم انداز میں یہ اصول پیش نظر ہے کہ ذریعہ علم فقط عقل ہے۔ کبھی واضح طور پر یہ موقف ہے کہ عقل ہی ذریعہ علم حقیقت ہے اور چونکہ عقل معقولات کا ادراک کرتی ہے لہذا معقولات ہی حقیقت متصور ہوتے ہیں۔ گویا عقلیت عقل کے ذریعہ علم حقیقت ہونے کے باب میں لامحدود یقین کا موقف ہے جو متضاد نتائج تک پہنچانے کی بنا پر لامحدود بے یقینی میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسا کہ دورِ جدید کے فلسفہ میں ڈیکارٹ کی ثنویت' سپینوزا کی وحدتیت اور لائبنیز کی کثرتیت کی صورت میں ظاہر ہو کر حسیت کے لئے راستہ کھول دیتا ہے۔

حسیت کا بنیادی اصول

حسیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حواس ہی ذریعہ علم حقیقت ہیں' اس لئے محسوسات ہی حقیقت متصور ہوتے ہیں چونکہ حواس محسوسات ہی کا ادراک کرسکتے ہیں اس لئے عقل کی طرح حسیت بھی متضاد نتائج تک پہنچاتی ہے۔ چنانچہ حواس کی بنیاد پر محسوس کو حقیقت تسلیم کرنے سے انسانی فکر متضاد نتائج پر پہنچا۔ لاک نے حواس ظاہری کے ذریعے مادے کے حقیقت ہونے پر زور دیا۔ اسی اصول پر برکلے نے مادے کی نفی کے لئے یہ موقف اختیار کیا کہ مادہ بحیثیت جوہر کے کچھ نہیں' صرف کیفیات ذہن ہیں' جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ ہیوم نے اسی بنیاد پر ذہن کے جوہر ہونے کا انکار کرتے ہوئے اسے کیفیات نفس سے تعبیر کیا اور علم یقینی کا انکار کر دیا۔ جب کانٹ نے تنقید پر اپنے فکر کی بنیاد رکھی تو ثابت کیا کہ علم یقینی تو محسوس تک محدود ہے اور مابعدالطبیعیات بطور علم مدلل کے ناممکن ہے البتہ ایک مابعد الطبیعیتی نظریہ بطور ایقان و اذعان اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یوں انسانی علمیات کی نشوونما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی رہی مگر ابھی تک اس کی نشوونما کی تکمیل کا رخ متعین نہیں ہوسکا۔ تاریخ کے دورِ قدیم اور دورِ وسطی میں وجدان کو بھی ذریعہ علم حقیقت ٹھہرا گیا۔ مگر غیر تنقیدی یعنی صرف تحکمانہ (Dog Matic) انداز میں اور جب دورِ جدید میں وجدان کو ذریعہ علم تصور کیا گیا تو یہ امتیاز پیش نظر نہیں رہ سکا کہ خرق عادت اور مذہبی واردات میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے۔ ولیم جیمز کی (Varities Of Religious Experience) میں چار سو سے زائد واردات کا بیان ہے مگر وہ سب کی سب خرق عادت بظاہر (Occult Phenomena) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وحی اور مذہبی واردات اور خرق عادت مظاہر ایک دوسرے سے

بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اگر مذہبی واردات کو ماورائی حقائق پر ایمان کے بجائے ان کے علم کا ذریعہ تصور کیا جائے تو احتیاجِ وحی باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا مذہب کی بنیاد "غیر ضروری" ہو جاتی ہے۔

نفسیات

جو علم النفس قرآنی وحی سے میسر آتا ہے اس کی رو سے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ﴿روم:۳۰﴾ میں جس فطرت کی طرف اشارہ ہے اس کی دو پہلو ہیں:

ایک بالقوۃ فطرت اور

دوسرے بالفعل فطرت۔

بالقوۃ فطرت عبارت ہے۔

۱۔ فجور و تقویٰ کے امتیاز سے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○

﴿الشمس:۸﴾

۲۔ ربوبیت کے اقرار سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰی ج

﴿اعراف:۱۷۲﴾

۳۔ اپنے نفس کی بصیرت سے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ

﴿القیامہ:۱۴﴾

۴۔ امانت کی ذمہ داری کے احساس سے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ○ ﴿احزاب:۷۲﴾

اس بالقوۃ فطرت کی حیثیت ایک ایسی استعداد کی ہے جو نشوونما نہ پا سکے تو

اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسی کو نشوونما دے کر' ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت کو منضبط اور منقاد بنانے کے لئے انبیاء کی بعثت ہوتی رہی تھی۔ بالفعل فطرت جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل ہے جن کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ ﴿آل عمران:۱۴﴾

بالفعل فطرت اور بالقوہ فطرت کے درمیان تضاد بالقوہ فطرت کی نشوونما کے لئے ایک سازگار شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالقوہ فطرت کی بنیاد پر انسان کی نسبت یہ کہا گیا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ﴿التین:۴﴾

بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ نفسیات کی رو سے فطرت انسانی صرف جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل متصور ہوتی ہے اور شعور کے تینوں پہلو جذبہ' ارادہ اور ادراک جبلی داعیات سے وابستہ ہیں۔

اخلاقیات

وحی کے عطا کردہ علم الاخلاق کے مسائل یہ ہیں کہ:

۱۔ حیات انسانی کے اخلاقی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت کیا ہے؟

۲۔ اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے؟

۳۔ اخلاقی اصلاح کس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں

ہو گی؟

۴۔ حصول نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کیا ہے؟

۵۔ حصول نصب العین کا ضامن لائحہ عمل کیا ہو گا؟

۶۔ اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہے؟

۷۔ اس عمل کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟

۸۔ اس معیار کے مطابق زندگی کے ڈھلنے کا نمونہ کمال کیا ہے؟

۹۔ وہ محرک کیا ہے جو اخلاقی جدوجہد میں استقامت دلا دے اور انحراف نہ کرنے دے۔

بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا موضوع فضائل اخلاق اور ان کا معیار ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہے؟ ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعی اساس کیا ہے؟ اخلاقیات سے قرآنی علم الاخلاق کے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اخلاقیات کا مسئلہ پیدا ہی تب ہو گا جب قرآنی علم الاخلاق کی روشنی میں زندگی کے اصلاح پذیر ہو جانے کے بعد فضائل اخلاق وجود میں آ جائیں۔ پھر فضائل اخلاق کو مشاہدے سے جمع کیا جائے گا۔ پھر ان کی گروہ بندی کی جائے گی۔ پھر معیارِ اخلاق متعین کیا جا سکے گا۔ اور انسانی اخلاقیات کی رُو سے مقصود ہی معیار متصور ہو گا جس کے معنی یہ ہیں کہ جس فعل سے مقصود حاصل ہو وہی نیکی متصور ہو گا اور جس فعل سے مقصود حاصل نہ ہو وہی بدی متصور ہو گا۔ اخلاقیات کا وہ نظریہ جو "حکم" کو معیارِ اخلاق سمجھتا ہے مذہب کے زیرِ اثر متعین ہوتا ہے۔

عمرانیات

قرآنی وحی سے متعین ہونے والی عمرانیات کا مسئلہ یہ ہے کہ:

۱۔ معاشرتی زندگی کی اصلاح طلب خاصیت کیا ہے؟

۲۔ اس کی اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے؟

۳۔ معاشرے کی اصلاح کس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں ہوگی؟

۴۔ حصول نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کیا ہوگی؟

۵۔ حصول نصب العین کا ضامن لائحہ عمل کیا ہوگا؟

۶۔ اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہوگی؟

۷۔ اس عمل کو پرکھنے کا معیار کیا ہوگا؟

۸۔ معیار کے مطابق زندگی کے ڈھلنے کا نمونہ کمال کیا ہوگا؟ اور

۹۔ وہ محرک کیا ہوگا جو استقامت ولا دے اور انحراف نہ کرنے دے؟

بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ عمرانیات کا مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ کن محرکات کی بنا پر وہ وجود میں آتا ہے؟ اس کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ جیسا معاشرہ ہوگا اسی کے مشاہدے سے معاشرے کی نوعیت متعین ہوگی۔ بایں ہمہ ان مسائل کا صحیح ترین حل میسر آنے کے باوجود قرآنی عمرانیات کے مسائل انسانی استعداد کی زائیدہ عمرانیات سے کبھی حل نہ ہوسکیں گے کیونکہ جن مسلمات کی بنا پر انسانی ذہن کی پیدا کردہ عمرانیات مدون ہوگی ان میں اس کی کوئی گنجائش نہ ہوگی کہ قرآنی عمرانیات کے مسائل کا حل میسر آسکے۔ یہی وجہ ہے

کہ تمام ماہرین عمرانیات مثالی معاشرے کے وجود میں آنے کو خیالی جنت تصور کرتے ہیں۔

معاشیات

م بالوجی کی رو سے معیشت کے علم کا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کو معاشی عدل کے نمونے پر ڈھالنے کے لئے معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل کیسے رفع ہوگا؟ یعنی:

۱۔ معاشی پہلو کی اصلاح طلب خصوصیت کیا ہے؟

۲۔ اصلاح پذیری کا تصور کیا ہوگا؟

۳۔ معاشی عدل کس نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں پیدا ہوگا؟

۴۔ حصول نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کیا ہوگی؟

۵۔ حصول نصب العین کا ضامن لائحہ عمل کیا ہوگا؟

۶۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہوگی؟

۷۔ اس عمل کو پرکھنے کا معیار کیا ہوگا؟

۔ معیار کے مطابق معاشی زندگی کے ڈھلنے کا نمونہ کمال کیا ہوگا؟

۹۔ وہ محرک کیا ہوگا جو استقامت دلا دے اور انحراف نہ کرنے دے؟

اس کے برخلاف انسانی استعداد کی زائیدہ معاشیات کا موضوع تخلیق دولت کا نظام ہے جو گلہ بانی نظام، تجارتی سرمایہ داری نظام، زرعی نظام، جاگیرداری نظام، مستغراتی نظام، صنعتی سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام کے معاشی تصورات کی روشنی میں الگ الگ متعین ہوگا اور اس کا کوئی امکان نہیں کہ معاشی عدل کی خاطر تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرنے کی تدبیر ان نظاموں سے میسر آسکے۔

سیاسیات

علم بالوحی کے عطا کردہ سیاسی نظام کا مسئلہ یہ ہو گا کہ:

۱۔ سیاسی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت کیا ہے؟

۲۔ اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے؟

۳۔ کس نصب العین کے حوالے سے اصلاح ہو گی؟

۴۔ حصول نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کیا ہو گی؟

۵۔ حصول نصب العین کا ضامن لائحہ عمل کیا ہو گا؟

۶۔ اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہو گی؟

۷۔ اس عمل کو پرکھنے کا معیار کیا ہو گا؟

۸۔ زندگی کے سیاسی پہلو میں معیار کے مطابق ڈھلنے کا نمونہ کمال کیا ہو گا؟

۹۔ وہ محرک کیا ہو گا جو اس جدوجہد سے انحراف نہ کرنے دے۔

بخلاف اس کے انسانی استعداد کے زائیدہ سیاسی فکر کے مسائل یہ ہیں کہ کامل ملوکیت' جمہوریت اور آمریت میں سے کسی نظام کو' جس کے اچھے یا برے تجربات سے انسانیت گزری ہے' اختیار کرنا قرار پائے گا۔ لیکن کسی نظام میں معاہدۂ عمرانی کے قیام کی ایسی ضمانت میسر نہ آسکے گی۔ جس میں ہوس اقتدار کا تدارک ہو سکے' سیاسی تناقض رفع ہو سکے اور فلاحی ریاست وجود میں آسکے۔

تاریخ

قرآنی وحی کے عطا کردہ تاریخی عمل کی تاریخ کا مسئلہ یہ ہے کہ اقوام و امم اور ملل کے زوال کو عروج میں کیسے بدلا جا سکتا ہے؟ وہ قانون کونسا ہے جس سے

تاریخی جدوجہد کے نتائج متعین ہوتے ہیں اور اس کی ضمانت کس قانون میں میسر آتی ہے کہ اصحابِ حق ہی غالب ہوں گے اور اصحابِ باطل ہی مغلوب ہوں گے اور غلبہ حق کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی شکست ناممکن ہوگی۔

بخلاف اس کے انسانی ذہن کی تراشیدہ علم تاریخ کی حیثیت یا تو واقعات ماسبق کے بیان کی ہوگی اور اس کی کوئی ضمانت ہوگی کہ بیان کی صحت متعین ہوسکے۔ اگر میکانی نظریہ کائنات کا اثر تاریخ میں سرایت کرے گا تو تاریخی حرکت میں عروج و زوال دونوں کی نفی ہو جائے گی کیونکہ میکانی نظریہ کائنات یہ ہے کہ نظام کائنات میں کوئی مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا تاریخ کی حرکت کا کوئی رُخ نہیں ہوسکتا------ نہ عروج کا' نہ زوال کا۔ اگر مسیحی کلام کے زیراثر تاریخ کی توجیہ کی جائے گی تو تاریخی حرکت معصیت اولیٰ کی بنا پر زوال ہی کی تاریخ متصور ہوگی۔ اگر حیاتیاتی علوم کے نظریہ ارتقاء کے زیراثر تاریخ کی توجیہ کی جائے گی تو تاریخی حرکت عروج و ارتقاء ہی کی حرکت متصور ہوگی اور اس موقف میں دو تعبیریں سامنے آئیں گی:

ایک یہ کہ تاریخی حرکت خط مستقیم کی صورت میں ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جدید ترین ہی کامل ترین ہے' یا یہ کہ تاریخی حرکت خط غیر منحنی (Zigzag) کی صورت میں ہے جس میں ہر دورِ ارتقاء میں بے شمار نشیب و فراز ہیں۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ تاریخی حرکت تصورات کی جدلیت سے متعین ہوتی ہے جس میں تین مراحل ہیں:

۱۔ اثبات

۲۔ نفی اور

۳۔ تطبیق

اور تینوں مدارج کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک

نظریہ یہ بھی ہے کہ تاریخی حرکت مادی جدلیت سے متعین ہوتی ہے۔ مگر ہر تعبیر میں یاس غالب رہتی ہے۔

دونوں قسم کے ان تمدنی علوم میں مماثلت کی جستجو کے نتیجے میں انسانی استعداد کے زائید تاریخی نظریات غالب رہیں تو توجیہ و تعلیل کے نقطہ نظر کے ... لب ہونے کی بنا پر تاریخی حرکت کی سمت بدل سکنے کا اعتماد بحال نہ ہوسکے گا۔ ان ... ات کے پیش نظر رہنے ہی سے شعورِ علمی کا امتیاز ملحوظ رکھنے کا تقاضا پورا ہوسکے گا اور ہم آہنگی کی تلاش میں امتیازات کو نظرانداز کرنے کا انجام وہی ہوگا جو ہمارے ذہنی فکر کی تاریخ میں ہوا کہ علوم عقلی علوم نقلی پر اور انسانی علوم قرآنی علوم پر غالب آگئے جس کی بناء پر قرآن کی رہنمائی بے نتیجہ ہو کر رہ گئی۔

۲۔ تعین

منہاج کا دوسرا مرحلہ قرآنی علوم کی ماہیت کو واضح کرنا ہے، جسے تعین کہا جائے گا۔

علم بالوحی کی ماہیت یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن مجید نظام تکوین میں مضمر غایات تک پہنچانے کی ہدایت پر مشتمل ہے۔ پیغمبرانہ وحی انسان کی کسی استعداد کا نام نہیں بلکہ عطیہ خاص، وہب مجرد، بذل صرف اور فضل محض ہے۔

۲۔ قرآن مجید نصب العین متعین کرکے زندگی میں انقلابی اصلاح کرتا ہے۔ انفرادی زندگی کے تینوں پہلوؤں (ذہنی، ایمانی اور اخلاقی) کی اصلاح یعنی انسان مرتضیٰ بننے کے نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے سے ہوسکتی

ہے۔

۳۔ اجتماعی زندگی اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے۔ اس کے تین پہلو ہیں: معاشرتی، معاشی اور سیاسی، جن کی اصلاح ایسے مثالی معاشرے کے قیام سے وابستہ ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ○

﴿النساء:۱﴾

اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط ﴿آل عمران:۱۱۰﴾

جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ ﴿بقرہ:۳۸﴾

اور اسی ضمن میں قرآن ہی سے تمام موجبات خوف و غم اور ان کے تدارک کے لئے رہنمائی میسر آئے گی۔

۔ بین الاقوامی زندگی، جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل، یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہے جس کے نتیجے میں انسانیت امن و امنیت اور سکون و طمانیت سے محروم ہے۔ اس کی اصلاح قرآنی علم بین الاقوامی سطح پر دین حق کو غالب کر کے کرنا چاہتا ہے جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹:۳۳)

۵۔ حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کی حیثیت سے ایک تصورِ کائنات بھی عطا کرتا ہے۔

۶۔ حصول مقصد کی جدوجہد پر متحد کرنے کے لئے ایک زاویہ نگاہ بھی مہیا کرتا ہے۔

۷۔ جدوجہد کو پرکھنے کا معیار بھی تجویز کرتا ہے۔

۸۔ حتمی، قطعی اور یقینی طور پر نصب العین کے حاصل ہو کر رہنے کا لائحہ عمل بھی فراہم کرتا ہے۔

۹۔ ایک دعوت بھی تفویض کرتا ہے جس پر دین کے دوام و استمرار کا انحصار ہے۔

۱۰۔ جدوجہد سے پہلے جو یقین درکار ہے اس کی اساس بھی مہیا کرتا ہے۔

۱۱۔ حصول نصب العین میں جو قوانین موثر ہیں ان کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

۱۲۔ حق و باطل کے امتیازات بھی واضح کرتا ہے۔

۱۳۔ مفاد پرستوں سے صلح و جنگ کے قواعد بھی متعین کرتا ہے۔

۱۴۔ باطل سے متصادم ہونے کے لئے مناسب وقت بھی متعین کرتا ہے۔

۱۵۔ مفاد پرستی اور نفع بخشی کے ملے جلے رجحانات کی اصلاح کے طریقے بھی واضح کرتا ہے۔

۱۶۔ اخلاقی سیرت کی تشکیل کے ضوابط بھی سکھاتا ہے۔

۱۷۔ معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے طریقے بھی واضح کرتا ہے۔

۱۸۔ کائناتی سطح پر نشوونما کے ضامن قانون کی نشان دہی بھی کرتا ہے جس سے صرف نظر کر کے کامیابی متصور نہیں ہو سکتی۔

۱۹۔ بین الاقوامی کش مکش میں غلبے کو متعین کرنے والے قانون اور اس کی نتیجہ خیزی کی شرائط بھی متعین کرتا ہے۔

۲۰۔ سعادت و شقاوت کے اس قانون کی وضاحت بھی کرتا ہے جسے کوئی شیطانی طاقت اور کوئی مفاد پرست اور تخریبی جماعت کبھی شکست نہیں دے سکتی۔

اگر علم بالوحی کی ماہیت یہ ہو تو امت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد اس بنیاد پر کہ قرآن "حجتہ من بعد الرسل" ہے' اس کا مسئلہ' جس کے بہتر حل پر زوال کا تدارک منحصر ہے' یہ ہو گا کہ:

۱۔ اگر کوئی ایسا گروہ موجود ہو جو بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم اور نزول قرآنی کی غایت کو حاصل کرنا چاہے تو اس کا مقصود کیا ہے؟ اس کا تصورِ کائنات کیا ہو جو حصول غایت سے سازگار ہو؟ اس کا زاویہ نگاہ کیا ہو۔ معیار کیا ہو؟ دعوت کیا ہو؟ اور لائحہ عمل کیا ہو؟ جو:

آفاقی (عالمگیر) ہو تا کہ محدود وفاداریوں پر منظم ہونے والے گروہوں کے عناد سے محفوظ رکھے۔

مثبت ہو تا کہ منفی تصور سے پیدا ہونے والی یاس و ناامیدی کا شکار نہ ہو اور زندگی کو سہارا دے سکے۔

[illegible] ہو تا کہ حسن منطقی تصور کی طرح عملی حیثیت
سے بے نتیجہ نہ ہو اور خاطر خواہ نتائج پیدا کر سکے۔

قابلِ عمل ہو تا کہ اس کے لئے جدوجہد کرنے کی
ترغیب پیدا ہو۔

[illegible] ہو تا کہ اسے واقعہ بنانے کی جدوجہد
میں جتنی شدت ضروری ہے وہ بطورِ خود پیدا ہو سکے۔ اور حتماً'
قطعاً اور یقیناً' نتیجہ خیز ہو تا کہ اس کی حقانیت منطقی دلیل سے
بے نیاز ہو جائے۔

۳۔ تضمن (Implication)

مسئلے کو حل کرنے کے عمل (Procedure) میں تیسرا مرحلہ تضمن ہے جو ان شرائط (مضمرات کے تجزیے) پر مشتمل ہے جن پر کامیابی کا انحصار ہے۔ مثلاً غایت تخلیق کائنات' غایت بعثت نبوی ﷺ اور غایت نزول وحی قرآنی کا ایک ہی غایت ہونا اور ناقابل تغیر اور ناقابل شکست کائناتی قانون نشوونما' تاریخی قانون تضاد' اور اخلاقی قانون سعادت و شقاوت کی تشکیل' ان کے وظیفے کی تعیین اور ان خاصیت کی وضاحت۔

کائناتی قانون نشوونما وہ قانون ہے جس پر مقصد کے قریب تر ہوتے جانے کا انحصار ہے۔ وہ مزاحمت اور مزاحمت کی مزاحمت کا قانون ہے' جس کی تشکیل قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿الفرقان:۳۱﴾

کہ ہم نے ہر پیغمبر کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا جو پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کرتا ہے اور پیغمبر اور اس کے متبعین کی جانب سے جب مزاحمت کی مزاحمت ہوتی ہے تو اصحابِ حق کامیاب ہوتے ہیں۔

تاریخی قانون وہ قانون ہے جس سے تاریخی کش مکش کے نتائج متعین ہوتے ہیں اس کی تشکیل از روئے قرآن یہ ہے کہ دو گروہ ہوں جنہیں قرآن حزب اللہ اور حزب الشیطان سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی دو گروہ اصحابِ یمین اور اصحابِ شمال یا اصحابِ میمنہ اور اصحابِ مشئمہ کہلاتے ہیں۔ یہی قرآن کے نزدیک اصحابِ حق اور اصحابِ باطل متصور ہوتے ہیں جنہیں قرآن خیرالبریہ اور شرالبریہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان دونوں کے اپنے اپنے مقاصد ہیں۔ حزب اللہ حق کو غالب کرنا چاہتی ہے اور حزب الشیطان باطل (مزعومہ مفاد پرستی) کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ان دونوں گروہوں کے اپنے اپنے مقصد کے ساتھ دو متضاد وفاداریاں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے دو منظم ارادے ہوتے ہیں--- ایک حزب اللہ کا' دوسرا حزب الشیطان کا--- ان ارادوں کے درمیان تصادم ہو کر رہتا ہے۔

وہ اخلاقی قانون سعادت و شقاوت جسے کوئی شیطانی طاقت اور کوئی مفاد پرست جماعت کبھی شکست نہیں دے سکتی اور جس میں اس کی ضمانت ہے کہ حزب اللہ ہی غالب ہو کر رہے' اس کا غلبہ اسی قانونِ شقاوت و سعادت سے متعین ہوتا ہے جس کی تشکیل قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ (الشمس:۹'۱۰)

یعنی وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو حرص اور لالچ سے پاک کیا اور یقیناً وہ تباہ ہو گیا جس نے اسے حرص اور لالچ میں مبتلا

رکھا۔

کیونکہ جس کا نفس حرص اور لالچ سے پاک ہو جائے گا وہی دوسروں کو نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما دے گا' اس لئے کامیاب ہوگا اور جس کا نفس حرص اور لالچ میں مبتلا رہے گا وہی نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما دینے میں رکاوٹ ڈالے گا۔ چونکہ قرآن مجید کے نزدیک نفع بخشی ہی حق ہے اور مزعومہ مفاد ہی باطل ہے' اس لئے حق کا غالب آنا اور باطل کا مغلوب ہونا ضروری ہے۔

ماقبل و مابعد میں ربط پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ مفہوم خبط ہو جائے گا۔ اور سیکھنے کے تین طریقے ہیں:

۱۔ بصیرت' کیونکہ بصیرت کے معنی ہیں ایمان اور عمل۔ عمل اور نتیجہ عمل کے تعلق کا ادراک۔

۲۔ تقلید یا پیروی' جس کی بدولت انسان دیکھ دیکھ کر اور پیروی کر کے سیکھتا ہے۔

۳۔ اقدام و خطا' یعنی جب انسان بار بار ناکامی کے تجربات سے گزرتا ہے تو وہ اپنے طرز عمل کو بدلتا ہے اور یوں کامیابی پر منتج ہونے والے طرز عمل کو اپناتا ہے۔

مگر چونکہ انسانی فطرت میں بالقوۃ فطرت اور بالفعل فطرت کی ثنویت موجود ہے اور ان دو پہلوؤں میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان نگہداری سے غافل ہو تو اس کی سیرت زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اندریں صورت اپنے آپ کو برحق سمجھنے والی جماعت اپنا احتساب غیرجانبداری سے نہ کرے تو اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ باطل کامیاب ہو رہا ہے حالانکہ باطل کی کامیابی نفع بخشی سے متعین ہو رہی ہوتی ہے

کیونکہ اس کا نفع بخشی' فائدہ رسانی اور نشوونما دینے کا طرزِ عمل' جو اس نے اقدام و خطا سے سیکھا ہے' قانونِ پروردگاری سے' ہم آہنگ ہو جاتا ہے' خواہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ﴿النور:۵۷﴾

کہ یہ گمان نہ کرنا کہ کفر کرنے والے اللہ کو زمین میں یعنی سیاسی اور معاشی اعتبار سے ناجز کر دیں گے۔

کیونکہ وہ اس پر مجبور ہوں گے کہ اپنی مفاد پرستی کی خاطر نفع بخشی کا طرزِ عمل اختیار کریں اور وہ وہی کرنے پر مجبور ہوں گے جو اللہ چاہتا ہے۔ جب سے ہم نے اس حقیقت سے صرف نظر کیا ہے' ہم یہ اعتماد ضائع کر چکے ہیں کہ حق ہی غالب رہتا ہے بلکہ اس کے برعکس ہمیں غلبہ باطل کا یقین ہو چلا ہے۔

۴۔ حدود

مسئلے کو حل کرنے کے عمل کا چوتھا مرحلہ علم بالوحی کی صحت کے ان حدود کو واضح کرنا ہے جن سے تجاوز کرنے سے علم بالوحی بھی انسانی علم کی طرح بے اثر ہو جاتا ہے وہ حدود یہ ہیں کہ اگر علم بالوحی کو انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھال دیا جائے تو اس سے عملی زندگی میں نتائج پیدا ہونے بند ہو جائیں گے۔ مثلاً جب علم بالوحی سے وہ مسائل حل کئے جانے لگیں جو انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے مسائل ہیں۔ جب قرآن سے اس مسئلے کا حل طلب کیا جانے لگے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں' ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے تو پھر قرآن کے حدود میں رہتے ہوئے یہ مسئلہ حل نہ کیا جا سکے گا کہ زندگی فضائل اخلاق کے نمونے پر کیونکر ڈھلے؟ اسی طرح جب قرآن سے عمرانیات کے اس مسئلے کا حل

طلب کیا جانے لگے کہ معاشرہ کیا ہے' کیسے ترقی کرتا ہے اور کیسے زوال پذیر ہوتا ہے اور مثالی معاشرہ' جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو' اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور ایسے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں' وجود میں کیسے لایا جائے؟ تو ظاہر ہے کہ قرآن میں ہم ان مسائل کا حل تلاش نہیں کرسکتے۔ کیونکہ واقفیت کے علم اور غایت کے علم میں فرق ہے واقفیت کے علم کا مقصود اور نتیجہ خیزی سے کوئی تعلق نہیں۔

اب اگر علم بالوحی کی ماہیت وہی ہے جو "تعین" کے سلسلے میں بیان ہوئی ہے تو علم بالوحی کے مسائل کا حل' جنہیں انسانی علم کے مسائل سے متمیز کرکے "تمیز" کے تحت بیان کیا گیا ہے نصوص قرآنی میں کسی تعبیر' کسی تاویل اور کسی تفسیر کے بغیر میسر آنا چاہیئے۔

قرآنی وحی نے خالق کائنات کی بنائی ہوئی انسانی فطرت پر قانون کی بنیاد رکھی ہے اور قدرتی حقوق متعین کرکے قانون میں لوگوں کے فرائض اور حقوق تسلیم کیے ہیں۔ بخلاف اس کے انسانی استعداد کا زائیدہ قانون رسم و رواج سے حقوق کو متعین کرتا ہے اور انسانی ساخت کا قانون فطری حقوق کو پیش نظر نہ رکھنے کی بنا پر خود ہی حقوق کو تسلیم کرتا اور خود ہی ان کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا دنیا کی کسی ریاست کی کسی عدالت میں داد رسی اور حقیقی عدل گستری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

منہاج کا تعلق موضوع اور اس کے متعلقہ مسائل سے ہے جنہیں حل کرنا درکار ہے۔ علم بالوحی کا موضوع "الکتب" ہے اور زوال میں مبتلا ہونے کے بعد "کتاب" کا مفہوم لغت کے حوالے سے متعین کرنے کا اثر یہ ہوا کہ قرآنی مفہوم "کتاب" تک پہنچنا اور زوال سے نکلنے کے لئے "کتاب" سے ہدایت طلب کرنا

دشوار ہوگیا اور چونکہ لغت کے حوالے سے کتاب اوامرونواہی کے لکھے ہوئے ضابطے سے زیادہ متصور نہ ہو سکی اس لئے الکتب سے قانون سازی میں رہنمائی طلب کرنے کے سوا کوئی تمنا نہ کی جا سکی۔

کتاب کا قرآنی مفہوم

کتاب کا مفہوم قرآن سے اخذ کرنے کے لئے اس آیت پاک کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا:

وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۝ ﴿شوریٰ:۵۲﴾

کہ یہ بات آپ ﷺ کا ادراک ذاتی نہیں ہے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ یعنی کتاب اور ایمان کا مفہوم آپ ﷺ کو وحی سے معلوم ہوا۔

کتاب کے حوالے سے توریت' زبور اور انجیل کا تصور تو موجود تھا اس لئے آپ ﷺ کا قرآنی مفہوم ان تینوں سے متمیز ہونا چاہیئے۔ لہٰذا جن آیات میں کتاب کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ دو آیات ہیں:

۱۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط ﴿یونس:۴۹﴾

یعنی ہر اُمت کے لئے ایک فیصلہ کن ساعت ہے۔

۲۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ ﴿الرعد:۳۸﴾

یعنی ہر فیصلہ کن ساعت کے لئے کتاب ضروری ہے۔

کتاب کیوں ضروری ہے؟ اس کا تعلق اس فیصلے سے ہے جو فیصلہ کن ساعت میں طے پانا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کونسی اُمت اس کی حق دار ہے کہ وہ باقی رہے اور ترقی کرے اور کونسی اُمت اس کی سزاوار ہے کہ اسے نابود کر دیا جائے۔ جس

کتاب پر اس فیصلے کا انحصار ہے اسے یہ شرائط پوری کرنا ہوں گی:

ا۔ حیات بخشی کا ضامن نصب العین متعین کرے۔

۲۔ نصب العین کے حاصل ہو کر رہنے کے یقین کی اساس مہیا کرے۔

۳۔ حصول نصب العین کا ضامن لائحہ عمل فراہم کرے۔

اس کے بغیر کافروں پر قرآن مجید کے اس طنز کا جواز پیدا نہیں ہوتا:

لَا هُدًى وَّلَا كِتَابَ الْمُنِيْرِ ط

کہ نہ حیات بخشی کا ضامن نصب العین ہے نہ اسے حاصل کرنے کا لائحہ عمل۔ لہٰذا بحیثیت قرآنی علم کے موضوع کے جس کتاب کی پیروی زندگی کی ضمانت دیتی ہے اور جس کی خلاف ورزی تباہی کا موجب ہوتی ہے اس کے مشمولات یہ ہیں:

ا۔ حیات بخشی کا ضامن نصب العین۔

۲۔ اس نصب العین کے حاصل ہونے کے یقین کی اساس۔

۳۔ وہ زاویہ نگاہ جو نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو متحد کر دے۔

۴۔ وہ لائحہ عمل جس میں حصول نصب العین کی ضمانت ہو۔

۵۔ وہ معیار جس سے حصول نصب العین کی جدوجہد کو پرکھا جائے۔

۶۔ کامیابی کا نمونہ کمال۔

۷۔ وہ محرک جو حصول نصب العین کی جدوجہد سے انحراف نہ کرنے دے اور استقامت دلا دے۔

اب کتاب کے قرآنی مفہوم کے حوالے سے جو مسائل سامنے آتے ہیں اور منہاج کے جزوِ دوم تعین (Determination) میں علم بالوحی کی ماہیت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، اگر وہ سخن طرازی نہ ہو تو منہاج سے پیدا ہونے والی تبویب یہ ہوگی:

[illegible]

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ
فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ ﴿البقرہ:۲۶۹﴾

تصورِ کائنات

وہ "تصورِ کائنات" جو علم بالوحی سے میسر آتا ہے دراصل ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات کا وہ جائزہ ہے جس کی بنیاد پر یہ طے پاتا ہے کہ یہ کائنات اپنی ماہیت اور ساخت کے اعتبار سے حصولِ نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی سے سازگاری کے اصول پر عدم محض سے تخلیق کے نتیجہ میں وجود میں لائی گئی ہے۔ لہٰذا قرآنی تصورِ کائنات صاحب علیہ التسلیم والتحیہ کے لئے تو علم کا مصداق ہے مگر ہمارے لئے اس کی حیثیت علم کی نہیں ایمان کی ہے۔

اگر قرآنی تصورِ کائنات، ماورائی حقیقت میں من حیث الکل کا علم ہوتا تو اس سے اس مسئلے کا حل میسر آتا کہ:

> "کائنات من حیث الکل کی ماہیت اصلی کیا ہے؟ اس میں انسان کا مقام و منصب کیا ہے؟ اور اس مقام و منصب کے پیش نظر اس کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اور شعورِ نظری کو جواب سے زیادہ صحت جواب کی دلیل پر اصرار ہوتا اور یہ مسئلہ پھر بھی حل ہوئے بغیر رہ جاتا کہ زندگی اس طرزِ عمل پر ڈھلے کیونکر؟"

مگر علم بالوحی بنیادی طور پر عمل کے مسئلے کا حل ہے۔ چونکہ عمل غایت یا

نصب العین کے حصول سے وابستہ ہے اس لئے علم بالوحی کو علم الغایات ہی سمجھنا اور اس سے اولاً اس مسئلے کا حل طلب کرنا چاہیے کہ:

"جس نصب العین کے حصول سے انسان کی فوز و فلاح وابستہ ہے اس کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس کیا ہے؟"

یہی وہ مسئلہ ہے جس کا حل "قرآنی تصورِ کائنات" کی صورت میں میسر آتا ہے۔ اس غایت کے حصول کی کامیاب جدوجہد ایک بار کی جاچکی ہے اور ان مسائل کا حل تاریخی حقیقت کے طور پر پیش کیا جاچکا ہے کہ:

زندگی اور کائنات کا کوئی مقصود ہے بھی کہ نہیں؟

اگر ہے تو اس کے حاصل ہو کر رہنے کا یقین بھی میسر آسکتا ہے یا نہیں؟

اخلاقی پہلو میں جو بے انضباطی غالب ہے وہ ضبط و انقیاد میں بدلی بھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

حیات اجتماعی جو اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے اس کے معاشرتی پہلو میں نسلی تفاخر اور خود پسندی کو "اخوت" میں' اور اس کے معاشی پہلو کے حرص و لالچ اور بخل کو انفاق و ایثار و احسان میں' اور اس کے سیاسی پہلو کی ہوسِ اقتدار کو ایسے معاہدۂ عمرانی میں بدلا بھی جاسکتا ہے یا نہیں جو مطاع اور مطیع دونوں کو منزل من اللہ احکام کے یکساں واجب التعمیل

ہونے کے شعور کے مطابق ڈھال دے۔

زندگی کے بین الاقوامی پہلو کے عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہونے کی خاصیت کے باوجود امن و عافیت سے ہم کنار ہو جانے کی ضامن ہدایت مہیا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

ان سب سوالات کا جواب ماضی میں حقیقت بن چکا ہے اور تاریخ اسلام اس کی شاہد ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی میں انسان مرتضٰی بننے کا نصب العین' اجتماعی زندگی میں مثالی معاشرے کے قیام کا نصب العین اور بین الاقوامی زندگی میں غلبہ دین حق کتاب و سنت کی پیروی سے حقیقت بن چکا ہے۔ اور آج بھی کتاب و سنت کی پیروی ہی سے تجربی توثیق و شہادت کی بنیاد پر علم بالوحی کی نتیجہ خیزی کا یقین راسخ ہو سکتا ہے۔ جو اعتماد جدوجہد سے پہلے ضروری ہے اس کی اساس وہ کائناتی قوانین ہیں جن کے بارے میں تخلیق کائنات کی "چگونگی" کے حوالے سے بصیرت پیدا ہو سکتی ہے۔

حکمت قرآنی کے محتویات (Contents)

- خصائص شش گانہ سے متصف' خالق
- ارادۂ تخلیق
- غایت تخلیق
- تخلیق کائنات کے مراتب وجود
- انسان کے لئے کائنات کا مسخر ہونا

⇦ کامیابی کی ضمانت

خالق

اللہ تعالیٰ ہی خالق کائنات ہے۔ صفات کمال سے متصف ہے۔

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ ﴿حشر:۲۲تا۲۴﴾

وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا بڑا مہربان' نہایت رحم والا' وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بادشاہ حقیقی' پاک ذات ہر عیب سے مبرا۔ امن دینے والا نگہبان' غالب' زبردست' بڑائی والا' خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ وہی خدا تمام مخلوقات کا خالق' ایجاد و اختراع کرنے والا' مورتیں بنانے والا' اس کے سب اچھے نام ہیں۔ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴿الانعام:۹۴﴾

بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اُگاتا ہے وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے والا ہے۔ یہی تو خدا ہے۔ تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔

يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ ﴿الروم:۱۹﴾

وہی زندہ کو مردوں سے نکالتا ہے اور وہی مردوں کو زندہ سے نکالتا ہے وہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم دوبارہ زمین سے نکالے جاؤ گے۔

جب انسان حصول کمال کے راستے میں سرِ راہ ہوسکنے والی مشکلات اور مزاحمتوں سے دوچار ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ خود ہے حقیقت سے ہم آہنگ اخلاقی کمال اور مسرت و جمال کی آرزو لیے ہوئے، دوسری طرف کائنات ہے مع اپنی وسعتوں اور فراخیوں کے تیرہ تار اور درندہ صفت معصیت سے لبریز اور قبیح منظر جو ان اخلاقی اور روحانی تمناؤں کے پورا ہونے میں سدِ راہ ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بالکل بے یار و مددگار اور بے بس و بے کس ہے۔ اس کی کامرانی کی شرط یہ ہے کہ کوئی ذات ایسی ہو جو اس کی مدد کرنے کی طاقت اور ارادہ رکھتی ہو۔ کیا ایسا کوئی وجود ہے؟ عقل و حواس اور وہم و قیاس کی کوئی کوشش ہمیں اس تک نہیں پہنچا سکتی۔

شعورِ مذہبی کا دعویٰ ہے کہ ایسا وجود ہے اور اگرچہ ہم اسے خود اپنی استعداد اور سعی سے نہیں پاسکتے لیکن وہ خود ہماری رہنمائی اپنی طرف کرنے کے لئے سبقت کرتا ہے اور وحی کے ذریعہ اپنی ہستی، اپنے کمالات، اپنے فضل اور اپنی ہدایت و اعانت کا یقین ہمیں خود دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعورِ مذہبی ایسی ذات کے وجود کا اثبات ہے تاکہ وہی فطری احتیاجات میں اس کی مدد کرسکے اور وہی صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرسکے۔ پس وہی رب اور رزاق وہی رحمٰن ہے کیونکہ وہ فطری ضروریات میں اس کی مدد کرتا ہے۔ وہی ہادی ہے کیونکہ صراط مستقیم پر ہدایت کرتا ہے اور وہی غفور رحیم ہے جو اُسے ناقابل برداشت بارِ گناہ اور گناہوں سے بھری فطرت سے نجات دیتا ہے لیکن وہ اس کی پوری مدد تب ہی کرسکتا ہے جب تمام واقعات آشکارا و پنہاں اور گزشتہ و آئندہ کو جانتا ہو۔ لہٰذا وہ سمیع و بصیر اور عالم الغیب والشہادہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ قادر ہے اور فعال لمایرید ہر اس بات کا کرنے والا جس کا ارادہ کرے لیکن یہ اس میں تب ہی ہو سکتی ہے جب وہ عالم اور انسان کا خالق یعنی عدم محض سے پیدا کرنے والا بھی ہو کیونکہ اگر اشیا کا وجود ان کا وجود میں آنا اس کے ارادے پر منحصر نہ ہو تو اشیاء کی حقیقت سے اس کی قدرت میں تقید پیدا ہو جائے گا اور اشیاء اور واقعات عالم پر اسے قدرت تامہ حاصل نہ رہ سکے گی اور اس صورت میں جس غایت کے لئے شعورِ مذہبی اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اُسے پورا نہیں کرسکے گا۔ پس وہ خالق اور باری بھی ہے۔ بیش ازیں اس میں انسان کو اوجِ کمال پر پہنچانے کا ارادہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ ذوالفضل العظیم ہے۔ پس اسے خود کو خیر کامل ہونا چاہیے۔ وہ قدوس ہے اور اس کی مدد فضل محض ہے۔ انسان اس کا مستحق ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ جب انسان اپنی بے بسی اور اس ذات کی قدرت کا اندازہ کرتا ہے تو رعب کے احساس اور عبودیت کے جذبے سے معمور ہو جاتا ہے

اور اس سے اپنی مدد اور ہدایت کے لئے التجا کرتا ہے۔ وہ معبود ہے اور مجیب الدعوات انسان کی دعاؤں کا قبول کرنے والا۔ اس ذات کی عظمت اور تنہا مستحق عبادت ہونے کے اعتبار سے وہ ایک ہے اور واحد ہے اور صمد جو سب سے بے نیاز ہے اور ہر احتیاج میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ان صفات کا اثبات انسانوں کی نسبت سے کیا جاتا ہے جنہیں ہم سمجھتے اور جانتے ہیں۔ لیکن اپنی کنہ اور حقیقت کے اعتبار سے یعنی فی نفسہ یا اس کی ماہیت کے اعتبار سے ہم اسے نہیں جانتے۔

لَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿طٰہٰ:۱۱۰﴾

"وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔"

خالق کائنات کو ماورائی (Transcendent) ہونا چاہیے۔ اُسے انسان اور عالم سے متبائن اور ان کا کلیتہ غیر ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ مایوسی جو انسان کی اپنی فطرت اور اس عالم مادی کی فطرت سے پیدا ہونے والی مزاحمتوں یا مشکلات میں مبتلا ہونے سے وجود میں آتی ہے اس امر کی مقتضی ہے کہ انسان کو مدد ایسے سرچشمے سے پہنچنی چاہیے جو اس کے مصائب کے سرچشمے سے قطعاً جدا ہو اور اسے تمام عالم انسان اور اشیاء پر قدرت تامہ حاصل ہو۔

خالق کائنات کی وحدت اثنینی (Dualistic) ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ محل جس میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی احتیاج پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان خود اپنی ذات اور اس عالم کی فطرت سے مایوس ہے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی مدد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایک ذات کامل کا وجود ہی ہے جس سے ہم آہنگ ہو کر ہی وہ اپنی امنگوں کے پورا کرنے اور اپنی مراد کو پہنچنے کے قابل ہو سکے گا۔ اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خدا ایک طرف ہو اور یہ عالم اور انسان دوسری طرف۔ یہ اپنی حقیقت کے

اعتبار سے بالکل مختلف اور متبائن ہونے چاہئیں۔ ایک کامل ہے دوسرا ناقص۔ دونوں موجود ہیں لیکن اس طرح کہ ایک دوسرے کا غیر محض ہے۔

خالق کائنات کو ایک ذات متشخص و ممتاز ہونا چاہیے۔ شخصیت (Personality) کا مقتضیٰ صرف شعور نہیں اس کا مقتضیٰ اس سے زیادہ ہے۔ اس کا مقتضیٰ ہے خود شعوری یعنی شعورِ خودی ہر دوسری چیز کے ماوراء اور غیر ہونے کی حیثیت سے تمام اشیاء کے ماوراء ہونے کا شعور۔ لیکن ہم ایسے وجود کا تصور بھی کرسکتے ہیں جس میں شعورِ خودی موجود ہو پھر بھی وہ اس کا مستحق نہ ہو کہ اس پر شخصیت کا اطلاق کیا جائے یعنی اس کے افعال اضطراری ہوں۔ پس شخصیت کا اطلاق تب ہی صحیح ہوگا کہ وہ صاحب اختیار ہو اور اپنے افعال کو اصول اخلاق کے مطابق متعین کرسکتا ہو۔ مزید برآں ہو سکتا ہے کہ ایسا وجود قدوس ہو اور عادل مطلق۔ لیکن شخصیت کے لئے یہ کافی نہیں۔ ہماری احتیاج اس سے زیادہ ہے۔ اس میں نہ صرف "عدل" کی قابلیت ہونی چاہیئے بلکہ "فضل" کی بھی۔ فضل ہی دراصل شخصیت کی امتیازی خصوصیت ہے جو انسان کو صرف وہی کچھ دے سکتا ہے جس کا یہ آپ مستحق ہو تو وہ شخصیت کے عناصر سے عاری سمجھا جائے گا۔ شعورِ مذہبی کو ایسا خالق و ناصر و ہادی درکار ہے جو بدرجہ اتم متشخص ہو۔ اسے درکار ہے کہ ذات باری میری اصلی حالت سے باخبر ہو اور مجھ پر فضل کرے۔ اس میں یہ قابلیت ہو کہ میری کوتاہی اور نقص کے باوجود میری تمناؤں کو پورا کرسکے یعنی جس چیز کے لئے میں آرزومند ہوں اس کے استحقاق سے محرومی کے باوجود وہ مجھے عطا کرسکے۔

خالق کو صاحب اختیار کامل ہونا چاہیے اور انسان کے اخلاقی اختیار کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ اختیار کے ایجابی معنی یہ ہیں کہ جسے مختار کہا جائے اس میں فی نفسہ اتنی آزادی موجود ہو کہ وہ اپنی فعلیت کو خود متعین کرسکے اور اس کے سلبی معنی یہ

ہیں کہ اس کے اعمال پر کسی قسم کا بیرونی تشدد یا اندرونی جبر موجود نہ ہو۔ شعورِ مذہبی ذات باری کو ایک وجودِ کامل تصور کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ اخلاقاً بھی کامل ہو، ذوالفضل اور صمد ہو۔ اب اخلاق لازماً اختیار کا مقتضیٰ ہے۔ ذات الٰہی اگر اخلاقاً کامل ہو تو اسے مختارِ کامل ہونا چاہیے۔ مزید برآں اسے صاحب فضل ہونا چاہیے جو شعورِ مذہبی کا ناگزیر مطالبہ ہے لہٰذا اسے مختار ہونا چاہیے ورنہ فضل اپنی مختلف صورتوں میں یعنی رحمانیت، رزاقیت، ہدایت، رحم، عفو اور جزا کی صورت میں اگر اس کی فطرت سے جبراً صادر ہو رہا ہو، تو وہ ہم تک بغیر تمنا کے پہنچے گا۔ نہ صرف بلکہ جبراً صادر ہونے کی صورت میں وہ فضل کہلائے جانے کا مستحق ہی نہ ہو گا۔ کیونکہ اخلاقی اعتبار سے یہ فضل اس سے بھی ادنیٰ قسم کا فضل ہو گا جو انسان جیسا ناقص الاختیار بھی کر سکتا ہے علاوہ ازیں اختیار مقتضیٰ ہے اس کی صمدیت کا۔ اسے کسی چیز کی احتیاج نہیں حتیٰ کہ دوسرے وجودوں کی طرف کسی توجہ یا کسی فعل کی نمائش کی بھی۔ پس وہ جو کچھ انسان کے حق میں کرتا ہے بے غرضی محض سے کرتا ہے اور لہٰذا مختارِ کامل ہے اور اس کے ساتھ انسان کے اختیارِ اخلاقی کی بھی گنجائش ہے کیونکہ اگر اس نے انسان کو کمالِ اخلاق کی تمنا اور فضل خداوندی کی تلاش کے لئے پیدا کیا ہے تو انسان کو ضرور صاحب اختیار ہونا چاہیے۔

بقا ایک اور خصوصیت ہے جو شعورِ مذہبی اور اس کی وحدتیت سے وابستہ ہے۔ شعورِ مذہبی کمال کا متمنی ہے۔ کمال جس کا انسان میں فقدان ہے اور جو بظاہر اس مختصر وقفہ حیات میں نہ تو اسے میسر آسکتا ہے اور نہ اسے اپنی جدوجہد سے حاصل ہو سکتا ہے تاآنکہ تمام کائنات ایک جدید نظام میں منقلب نہ ہو جائے، اسی وجہ سے وہ حیات بعد الموت اور وجودِ الوہیت کو تسلیم کرتا ہے جس کا خود بھی باقی اور حئی و قیوم ہونا ضروری ہے کیونکہ جو خود باقی نہ ہو وہ انسان کو بقائے بعد الموت عطا

نہیں کرسکتا لہٰذا حیات بعد الموت اسی مطالبہ کی وہ شرط ہے جو انسان کی ذات سے وابستہ ہے اور وجود الوہیت کا باقی اور حیّ و قیومؒ ہونا وہ شرط ہے جو ماحول خارجی سے وابستہ ہے۔

خالق کے لئے فقط یہ درکار ہے کہ وہ کسی حد تک معلوم ہو' یہ ہرگز درکار نہیں کہ وہ کلیتہ معلوم ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کلیتہ معلوم ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان میں اس کا مطالبہ ایسے وجود کی احتیاج سے پیدا ہوتا ہے جو اُسے بچا سکے۔ ہدایت دے سکے' مدد دے سکے' اندریں حالات کہ انسان اپنے تئیں محتاج سمجھتا ہے۔ لہٰذا خالق کو ایسی صفات سے متصف ہونا چاہیے جو اس مقصد کے لئے درکار ہیں لیکن وہ صفات خالق کے اس پہلو پر مشتمل ہیں جو انسان سے متعلق ہے یا اس سے نسبت رکھتا ہے۔ نہ تو وہ تمام کی تمام صفات ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کی کنہ مطلق کو واضح کریں۔ وہ عجز و انکسار جو انسان کے دل میں خالق کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی بے انتہا عظمت و شان پر نظر کرنے سے پیدا ہوتا ہے لازماً انسان کو یہ بات تسلیم کرنے کی طرف لے جاتا ہے کہ وہ ذات اس سے بلند ہے کہ انسان کی حقیر استعداد اس کا احاطہ کرسکے۔ حقیقتاً وہ انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہے اور انسان کو لا نعلمہ' الاھو' اور ما یحیطون بہ علما" کا اقرار کرنا پڑتا ہے یعنی اس امر کا اقرار کہ اسے خود اس کے سوائے کوئی نہیں جانتا اور انسان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ دراصل شعورِ مذہبی کی کامل ترین صورت یعنی وحی بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ ذات باری معلوم نہیں ہوسکتی۔ نہ تو وہ اپنی کنہ و حقیقت کے اعتبار سے معلوم ہوسکتی ہے اور نہ اپنی ان صفات کی جہت سے جو ہم سے متعلق ہیں کیونکہ اس کی ذات اور اس کی صفات ادراک سے ماوراء ہیں۔ شعورِ مذہبی کو صرف اذعان حاصل ہے۔ لہٰذا وہ خالق کی ایسی صفات میں یقین رکھتا ہے جن کی بناء پر اس

ہیں کہ اس کے اعمال پر کسی قسم کا بیرونی تشدد یا اندرونی جبر موجود نہ ہو۔ شعورِ مذہبی ذات باری کو ایک وجودِ کامل تصور کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ اخلاقاً بھی کامل ہو' ذوالفضل اور صمد ہو۔ اب اخلاق لازماً اختیار کا مقتضی ہے۔ ذات الٰہی اگر اخلاقاً کامل ہو تو اسے مختارِ کامل ہونا چاہیے۔ مزید برآں اسے صاحب فضل ہونا چاہیے جو شعورِ مذہبی کا ناگزیر مطالبہ ہے لہٰذا اسے مختار ہونا چاہیے ورنہ فضل اپنی مختلف صورتوں میں یعنی رحمانیت' رزاقیت' ہدایت' رحم' عفو اور جزا کی صورت میں اگر اس کی فطرت سے جبراً صادر ہو رہا ہو' تو وہ ہم تک بغیر تمنا کے پہنچے گا۔ نہ صرف بلکہ جبراً صادر ہونے کی صورت میں وہ فضل کہلائے جانے کا مستحق ہی نہ ہوگا۔ کیونکہ اخلاقی اعتبار سے یہ فضل اس سے بھی ادنیٰ قسم کا فضل ہوگا جو انسان جیسا ناقص الاختیار بھی کر سکتا ہے علاوہ ازیں اختیار مقتضی ہے اس کی صمدیت کا۔ اسے کسی چیز کی احتیاج نہیں حتیٰ کہ دوسرے وجودوں کی طرف کسی توجہ یا کسی فعل کی نمائش کی بھی۔ پس وہ جو کچھ انسان کے حق میں کرتا ہے بے غرضی محض سے کرتا ہے اور لہٰذا مختارِ کامل ہے اور اس کے ساتھ انسان کے اختیارِ اخلاقی کی بھی گنجائش ہے کیونکہ اگر اس نے انسان کو کمال اخلاق کی تمنا اور فضل خداوندی کی تلاش کے لئے پیدا کیا ہے تو انسان کو ضرور صاحب اختیار ہونا چاہیے۔

بقا ایک اور خصوصیت ہے جو شعورِ مذہبی اور اس کی وحدتیت سے وابستہ ہے۔ شعور مذہبی کمال کا متمنی ہے۔ کمال جس کا انسان میں فقدان ہے اور جو بظاہر اس مختصر وقفہ حیات میں نہ تو اسے میسر آسکتا ہے اور نہ اسے اپنی جدوجہد سے حاصل ہو سکتا ہے تاآنکہ تمام کائنات ایک جدید نظام میں منقلب نہ ہو جائے' اسی وجہ سے وہ حیات بعد الموت اور وجودِ الوہیت کو تسلیم کرتا ہے جس کا خود بھی باقی اور حئی و قیوم ہونا ضروری ہے کیونکہ جو خود باقی نہ ہو وہ انسان کو بقائے بعد الموت عطا

نہیں کرسکتا لہٰذا حیات بعد الموت اسی مطالبہ کی وہ شرط ہے جو انسان کی ذات سے وابستہ ہے اور وجود الوہیت کا باقی اور حئی و قیومؓ ہونا وہ شرط ہے جو ماحول خارجی سے وابستہ ہے۔

خالق کے لئے فقط یہ درکار ہے کہ وہ کسی حد تک معلوم ہو' یہ ہرگز درکار نہیں کہ وہ کلیتہ معلوم ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کلیتہ معلوم ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان میں اس کا مطالبہ ایسے وجود کی احتیاج سے پیدا ہوتا ہے جو اُسے بچا سکے۔ ہدایت دے سکے' مدد دے سکے' اندریں حالات کہ انسان اپنے تئیں محتاج سمجھتا ہے۔ لہٰذا خالق کو ایسی صفات سے متصف ہونا چاہیے جو اس مقصد کے لئے درکار ہیں لیکن وہ صفات خالق کے اس پہلو پر مشتمل ہیں جو انسان سے متعلق ہے یا اس سے نسبت رکھتا ہے۔ نہ تو وہ تمام کی تمام صفات ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کی کنہ مطلق کو واضح کریں۔ وہ عجز و انکسار جو انسان کے دل میں خالق کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی بے انتہا عظمت و شان پر نظر کرنے سے پیدا ہوتا ہے لازماً انسان کو یہ بات تسلیم کرنے کی طرف لے جاتا ہے کہ وہ ذات اس سے بلند ہے کہ انسان کی حقیر استعداد اس کا احاطہ کرسکے۔ حقیقتاً وہ انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہے اور انسان کو لا یعلمہ' الاھو' اور ما یحیطون بہ علما" کا اقرار کرنا پڑتا ہے یعنی اس امر کا اقرار کہ اسے خود اس کے سوائے کوئی نہیں جانتا اور انسان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ دراصل شعورِ مذہبی کی کامل ترین صورت یعنی وحی بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ ذات باری معلوم نہیں ہوسکتی۔ نہ تو وہ اپنی کنہ و حقیقت کے اعتبار سے معلوم ہوسکتی ہے اور نہ اپنی ان صفات کی جہت سے جو ہم سے متعلق ہیں کیونکہ اس کی ذات اور اس کی صفات ادراک سے ماوراء ہیں۔ شعورِ مذہبی کو صرف اذعان حاصل ہے۔ لہٰذا وہ خالق کی ایسی صفات میں یقین رکھتا ہے جن کی بناء پر اس

کے وجود کو تسلیم کرنے کی احتیاج تھی۔ حقیقت میں یہاں علم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

وجودِ خالق کی احتیاج انسان میں اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان کی روح میں بہت سی امنگیں ہیں۔ عالم جو انسان کے چاروں طرف محیط ہے وہ اور خود انسان کی اپنی جہالت ان امنگوں کے پورا ہونے کی راہ میں سرنہ ہوسکنے والی مزاحمتیں پیدا کرتے ہیں وہ مدد اور ہدایت جو خالق کی جانب سے آتی ہے اس امر کی مقتضی اور محرک ہے کہ انسان ان مزاحمتوں کے خلاف فاطلانہ جدوجہد کرے۔ اس جدوجہد کا منشا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت رضائے الٰہی کے مطابق ڈھالنے اور تمام کائنات کو اس کی مرضی کے مطابق بدلنے کی سعی کرے۔ یہ فقط ذہنی اور خارجی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں بلکہ خود یہ جدوجہد ہی ان امنگوں کی بتدریج تکمیل ہے۔ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ کائنات کے ختم ہونے تک جاری رہنا چاہیے اور بہت سخت اور ان تھک کوشش کا مقتضی ہے۔ درحقیقت شعورِ مذہبی متمنی ہے کچھ ہو جانے کا' کچھ حاصل کرنے کا' کچھ پیدا کرنے کا' یہ شعورِ عملی ہے اور عملیت پیدا کرتا ہے۔

صفات باری کو متکلمین نے ارسطو کے مقولات (Categories) جوہر و عرض کی تمثیل قیاس کیا' تو کبھی صفات کو "عین ذات" کبھی "زائد علی الذات" کبھی "لاعین ولاغیر" قرار دیا۔ یہ طرزِ فکر التباس میں مبتلا کرگیا۔ اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اللہ ہے۔ اس کی کچھ ذاتی صفات ہیں۔ وہ یہ اختیار خود طے فرماتا ہے کہ اسے ایسا عالم پیدا کرنا اور اسے چلانا مقصود ہے۔ اس کے مطابق وہ صفات جو اس عالم کی تکوین اور بقا اور ترقی اور زوال و عروج کے لئے ضروری ہیں بالارادہ اختیار فرماتا ہے۔ وہ صفات ارادی ہیں' ذاتی نہیں۔

تخلیق کائنات کا مقصد

کائنات کی تخلیق بغیر کسی مقصد کے نہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ط ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ط ﴿ص:۲۷﴾

ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کائنات ان میں ہے خالی از مصلحت نہیں پیدا کیا۔ یہ ان کا گمان ہے جو کافر ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط ﴿العنکبوت:۴۴﴾

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ O ﴿الانبیاء:۱۶﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان میں ہے' کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ O ﴿الروم:۸﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو جو کچھ ان دونوں میں ہے' مبنی برحق بنایا ہے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O ﴿یوسف:۲۱﴾

خدا اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ط ﴿الطلاق:۳﴾

بے شک خدا اپنے کام جو وہ کرنا چاہتا ہے' پورا کر دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ط یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ط ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ۔ ﴿الانعام:۹۴﴾

بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی پھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اُگاتا ہے' وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے والا ہے۔ یہی تو خدا ہے پھر تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔

یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ط وَکَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ۔ ﴿الروم:۱۹﴾

وہی زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور وہی مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم دوبارہ زمین سے نکالے جاؤ گے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴿الرعد:۱۵﴾

جتنی مخلوق آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے۔

وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْہًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ۔ ﴿ال عمران:۸۳﴾

سب اہل آسمان و زمین خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے
فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

لہٰذا اب اللہ تعالیٰ ہی جو اس کائنات اور انسان کا خالق ہے اور انسان کو اس کے کمال پر فائز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' رب ہے وہی رزاق ہے۔ وہی رحمٰن ہے وہی انسان کی تمام حاجات کو پورا کرتا ہے۔ وہی ہادی ہے جو صراط مستقیم پر ہدایت کرتا ہے وہی غفورٌ رحیم ہے جو انسان کو ناقابل برداشت بارِ گناہ سے نجات دیتا ہے۔

لیکن وہ اس کی پوری اور حقیقی مدد تب ہی کرسکتا ہے جب وہ تمام واقعات آشکارا و پنہاں' گزشتہ و آئندہ کو جانتا ہو لہٰذا وہ سمیع بصیر اور عالم الغیب والشہادہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں وہ قادر ہے اور ہر اس چیز کا کر کے رہنے والا جس کا وہ ارادہ کرے۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا۔ ﴿الفرقان:۳۱﴾

اور تمہارا پروردگار ہدایت دینے اور مدد کرنے کو کافی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿ہود:۱۰۷﴾

بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ ﴿الحج:۱۴﴾

کچھ شک نہیں کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

تخلیق پر ایمان کیوں ضروری ہے؟

دراصل تخلیق کے معنی ہیں کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لانا۔ تخلیق اس لئے ضروری ہے کہ اگر اشیاء کا وجود خالق کے ارادے پر منحصر نہ ہو تو اشیاء کی

کوئی اپنی ذاتی حقیقت و ماہیت ہوگی اور وہ باری تعالیٰ کے تصرف میں حائل ہوگی اور یوں اس کی قدرت کاملہ میں ایک تقید پیدا ہو جائے گا اور اشیاء اور واقعات عالم پر قدرت تامہ باقی نہ رہ سکے گی اور اس صورت میں اس غایت کو جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے وجود کو شعورِ مذہبی تسلیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ پورا نہ کرسکے گا یعنی جب تک اللہ تعالیٰ عدم محض سے کائنات کا پیدا کرنے والا نہ ہو اس کے اثبات سے شعورِ مذہبی کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اللہ پاک فرماتا ہے:

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ‎۝ فَسُبْحَـٰنَ ٱلَّذِى بِيَدِهِۦ مَلَكُوتُ كُلِّ شَىْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ ﴿یٰسٓ:۸۲،۸۳﴾

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا۔ تو وہ ہو جاتی ہے۔ وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

تخلیقِ کائنات اور مراتبِ وجود

عمل تخلیق کو زیادہ قابل فہم یوں بنایا جا سکتا ہے کہ:

- اللہ پاک جب کسی شے کا ارادہ فرماتا ہے تو (شے جس کا مادہ "شاء" ہے) اس کا تصورِ کلی فرماتا ہے۔
- پھر اسے تمثل عطا فرماتا ہے۔ یہ ابھی تک عام تصورِ یا تمثل ہوتا ہے۔
- پھر اللہ پاک اس "تمثل" کو "زمان و مکان" میں قائم فرماتا ہے یعنی جزوی کے خواص اور منظوریت کی صفت عطا فرماتا ہے اور قوانین طبیعی کے تابع

فرما دیتا ہے۔ یوں عالم خارجی طبیعی وجود میں آجاتا ہے۔

- پھر اس کے ایک حصے کو "نمو" کی خاصیت عطا فرماتا ہے اور قانون ارتقاء کے تابع فرما دیتا ہے۔ یوں عالم نامی وجود میں آجاتا ہے۔
- پھر اس کے یعنی عالم نامی کے ایک حصے کو شعور عطا فرما کر اسے "غائی نیت" کے قانون کے تابع فرما دیتا ہے۔ یوں عالم حیوانی وجود میں آجاتا ہے۔
- پھر اس کے ایک حصے کو خود شعوری یعنی شعور کا شعور عطا فرماتا ہے اور بااختیار ارادے کے تابع فرما دیتا ہے۔ اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے) سے متصف ہو جاتا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۔ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ ﴿الدھر:۲،۳﴾

ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔ تو ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔۔۔ اور اسے رستہ بھی دکھا دیا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ﴿الکھف:۲۹﴾

کہہ دیجئے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

اسی کی طرف فطر الناس علیھا میں اشارہ ہے۔ یوں فطرت انسانی کے دو پہلو

ہو جاتے ہیں:

بالفعل فطرت اور

بالقوۃ فطرت

بالفعل فطرت انسان کے جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل ہے جو اپنی تکمیل بغیر کسی قید کے چاہتے ہیں جس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ ﴿ال عمران:۱۴﴾

لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔

بالقوہ فطرت فجور و تقویٰ کے امتیاز' ربوبیت کے اقرار' اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے جس کی نشاندہی ان آیات پاک میں کی گئی ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ ﴿الشمس:۸﴾

پھر اس کو فجور و تقویٰ کے اِمتیاز کا شعور عطا کیا۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ ۔ ﴿الاعراف:۱۷۲﴾

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ کہنے لگے کیوں نہیں!

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ۔

﴿القیامتہ:۱۴'۱۵﴾

بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے۔ اگرچہ عذر ومعذرت کرتا رہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ ﴿الاحزاب:۷۲﴾

ہم نے بارِ امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

مگر بالقوہ فطرت ایک ایسی استعداد ہے جو نشوونما نہ پاسکے تو اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ فطرت انسانی کی اس پہلو کو نشوونما دے کر ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت کو منضبط و منقاد بنانے ہی کے لئے انبیا علیہم السلام کی بعثت ہوتی رہی ہے۔

فطرت انسانی کے ان دو پہلوؤں (بالفعل اور بالقوہ) کی ثنویت اور اس سے پیدا ہونے والے تضاد کی بناء پر:

- انفرادی زندگی مجموعہ اضداد ہونے کے باعث اپنے تینوں (فکری' ایمانی' اخلاقی) پہلوؤں میں اور

۲۔ اجتماعی زندگی اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہونے کے باعث اپنے تینوں (معاشرتی' معاشی' سیاسی) پہلوؤں میں' اور

۳۔ بین الاقوامی زندگی عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہونے کے باعث۔

عروج و زوال کی مصداق ہے اور نظام کائنات میں مضمر کائناتی قانون نشوونما' تاریخی قانون تضاد اور اخلاقی قانون سعادت و شقاوت کے حوالے سے عروج حاصل کرتی ہے اور نگہداری نہ کی جاسکے تو زوال ہو کر رہتا ہے۔

کائناتی قانون نشوونما

نشوونما کے معنی مقصد کے قریب تر ہوتے جانا ہیں۔ اس قانون کی تشکیل قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ط ﴿فرقان:۳۱﴾

"ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا۔"

لہٰذا ہر نبی جب اپنی دعوت پیش کرتا ہے تو مجرموں کی جانب سے دعوت کی مزاحمت ہوتی ہے اور اس مزاحمت کی مزاحمت سے دعوت کامیاب ہوتی ہے۔ اور بعثت کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اس قانون کی خاصیت یہ ہے کہ بدلتا نہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا۔ ﴿فاطر:۴۳﴾

اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز تغیر نہیں پاؤ گے۔

یہ قانون ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے۔ یہ مزاحمت اور مزاحمت کی مزاحمت کا قانون ہے۔ اس قانون کا وظیفہ (Function) یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر

مقصود حاصل ہو کر رہتا ہے اور جب قومیں زوال میں مبتلا ہو کر اس قانون سے' اس کی ماہیت سے' اس کی خاصیت سے' اس کے وظیفے (Function) سے غافل ہو جاتی ہیں تو زوال میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔

تاریخی قانون تضاد

قانون نشوونما جب تاریخی قانون تضاد کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کی تشکیل یہ ہو جاتی ہے کہ:

۱۔ دو جماعتیں وجود میں آتی ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان۔

۲۔ ان دونوں کا اپنا اپنا مقصود ہوتا ہے۔ حزب اللہ کا مقصود "حق" (نفع بخشی' فیض رسانی) کو غالب کرنا اور حزب الشیطان کا مقصود "باطل" (مزعومہ مفاد) کی حفاظت کے لئے نفع بخشی اور فیض رسانی کو روکنا۔

۳۔ ان دونوں جماعتوں کی' اپنے اپنے مقصود سے وفاداری ہوتی ہے جس کے پیچھے دو منظم ارادے ہوتے ہیں۔ ایک حزب اللہ کا دوسرا حزب الشیطان کا۔

۴۔ ان ارادوں کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔

۵۔ اس تصادم کو کامیاب بنانے کے لئے دو پروگرام ہوتے ہیں۔ حزب اللہ کا پروگرام نفع بخشی اور فیض رسانی کا اور حزب الشیطان کا پروگرام نفع بخشی اور فیض رسانی کو روکنے کا تا کہ مزعومہ مفاد کو محفوظ کیا جا سکے۔ حزب اللہ اصحاب حق کی جماعت ہے اور حزب الشیطان اصحاب باطل کی۔ اور تاریخی کش مکش میں حق ہی کو غالب اور باطل ہی کو مغلوب ہونا چاہیے۔

۶۔ اس حتمیت کے ساتھ یہ نتیجہ اخلاقی قانون سعادت و شقاوت سے متعین ہوتا ہے جس کی تشکیل یہ ہے:

قدافلح من زکھا' وقد خاب من دسھا۔ ﴿الشمس:۹'۱۰﴾

یعنی وہ یقیناً فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ سے پاک کیا۔ اور یقیناً وہ تباہ ہو گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ میں مبتلا رکھا۔

اس قانون کی خاصیت یہ ہے کہ یہ حتماً نتیجہ خیز ہے۔ اس کا وظیفہ (Function) یہ ہے کہ اصحابِ حق ہی کامیاب ہوں اور اصحابِ باطل ہی ناکام۔ یہ تینوں قوانین حتمی نتیجہ خیزی کی ضمانت رکھتے ہیں۔ ان ہی کی پیروی سے عروج حاصل ہوتا ہے اور ان سے غافل ہو کر قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور زوال میں مبتلا رہتی ہیں۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ ﴿النور:۵۷﴾

"کہ یہ گمان نہ کرنا کہ انکار کرنے والے اللہ کو سیاسی اور معاشی اقتدار سے عاجز کر دیں گے۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو بھی اپنے مفاد کی خاطر نفع رسانی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

اب چونکہ انسانیت انبیاء کی پیروی سے حاصل ہونے والی بصیرت سے بھی سیکھتی ہے۔ اور اقدام خطا سے بھی۔ اس لئے جب زوال پذیر ہو کر مزعومہ مفاد کے درپے ہو گئی۔ تو تاریخی کش مکش نے حق و باطل کی کش مکش کے بجائے باطل اور

باطل کی کش مکش کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح اقوام کی کش مکش میں کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ اس پر منحصر ہوگیا کہ دانستہ یا نادانستہ دو متخاصم گروہوں میں سے کس جماعت کا پروگرام نفع بخشی میں زیادہ ہونے کی بنا پر مشیت ربانی سے زیادہ ہم آہنگ ہوگیا۔ یوں نظام تخلیق کے تحت اپنی ساخت میں انسان کی کامیابی سے سازگار ہونے کی بنا پر کامیابی کے حاصل ہو کر رہنے کی اساس میسر آتی ہے۔

علم بالوحی سے میسر آنے والی ہدایت کی پیروی سے عروج حاصل ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی سے قومیں زوال میں مبتلا ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا زوال، اسلام کی بناء پر ایک عالمی قوم ہونے، علم بالوحی سے میسر آنے والے نظام فکر و عمل کے داعی ہونے اور اپنے ہادی اعظم اور اللہ کے آخری رسول ﷺ کی امت ہونے کی حیثیت سے ہمارا زوال اس لئے ناگزیر تھا کہ دورِ مابعد نبوت میں قرآن مجید کے حجت ہونے کے ثبوت میں قرآن کی عطا کردہ ہدایت سے غفلت کرنے کے باوجود اس کی پیروی سے دوبارہ عروج حاصل ہونے کا مشاہدہ وہ بچشم خود سر کرسکیں اور جہاد سے غفلت اور انفاق فی سبیل اللہ میں بخل کے موجب زوال ہونے اور کائناتی قوانین میں دوبارہ عروج کی ضمانت موجود ہونے کی تجرباتی توثیق و شہادت سے یقین پر قائم ہوسکیں۔

ہم کرۂ ارض کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل ہیں اور دنیا کی ایک سو چار ریاستوں میں سینتالیس ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور دشمنان اسلام کی ہمارے خلاف عداوت میں جتنی شدت ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم مسلمان ایک ناقابل انکار حقیقت ہیں۔ ہم اپنی غایت کے حوالے سے ایک شعور پیدا کریں اور کتاب کی طرف رجوع کریں تو صرف ہم ہی ایک زندہ حقیقت ہیں۔

تخلیق

جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کرچکے ہیں کہ عمل تخلیق کو جس کا عقلیّت (Pationalism) کی بنیاد پر انکار کیا جاتا ہے عقلاً (Rationally) یوں زیادہ قابل فہم بنایا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ کسی شے کا تصورِ کلی قائم فرماتا ہے۔ پھر

۲۔ وہ اسے ایک تمثال (Image) میں تبدیل فرما دیتا ہے۔ وہ پھر بھی ایک عمومی تصور ہی رہتا ہے۔

۳۔ اس تمثال کو زمان و مکان میں پیش فرما دیتا ہے جو جزئیت کا اصول ہے۔

اب اس کا وجود ہے۔ وجود اسے تمثال کے درجے میں بھی حاصل تھا لیکن اس کی حیثیت حقیقتاً وجود کی نہ تھی۔ مذہب وجودِ خارجی (Realism) کا موازنہ باطنیت (Subjectivism) سے کریں تو واضح ہوگا کہ مذہب وجود خارجی یہ ہے کہ عالم خارجی ناظر (Subject) سے جدا بجائے خود موجود ہے اور عمل ادراک سے بلاواسطہ ادراک میں آتا ہے اور مدرکات (Sensa) کچھ "حقیقت" ہیں اور کچھ "نمود" بخلاف اس کے باطنیت (Subectivisim) کا موقف یہ ہے کہ عالم خارجی کا وجود خارج میں نہیں ہے بلکہ کائن کے ذہن میں ایک تصور کی حیثیت رکھتا ہے مگر تصور کی حیثیت یہ ہے کہ وہ غیر متصور کے ادراک میں نہیں آسکتا۔ زمان و مکاں سے متصف کرکے اللہ تعالیٰ اسے منظوریت کی صفت عطا فرماتا ہے اور اب وہ موجود فی الخارج کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ تو ہم یہ پاتے ہیں کہ شے فی نفسہ صفات موجودہ کا ایک مرکب ہے جو کسی جگہ یکجا ہوگئی ہیں۔ ہم اس سے زیادہ نہیں جانتے۔ ب صفات کو ایک ایک کرکے نظرانداز کرتے جایئے تو انجام کار کچھ باقی نہیں رہے گا

اور "شے" بالکل غائب ہو جائے گی۔

یہ معلوم ہو گا کہ وجود کی تعریف (Definition) کو صفات سے اخذ کیا تھا اور اسے جوہر کا نام دے دیا تھا۔ صفت ایک بسیط تصور متصور ہوتی ہے لہذا "شے" کا کوئی وجود اس کی صفات کے ماورا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ صفات (ہم نہیں جانتے کیوں اور کیسے؟) یکجا ہو گئی ہیں اور یہی مرکب ایک "شے" کہلاتا ہے۔ ان صفات میں سے کچھ مستقلا موجود ہیں۔ کچھ ایک مدت کے لئے کچھ صرف چند لمحات کے لئے۔

لہذا صفات استعدادیں ہیں جو قوۃ سے فعل میں آگئی ہیں اس لئے واقعی شے ایک مسلسل اور غیر مسلسل عمل ہے۔ امر واقعہ بن جانے سے پہلے صفات محض استعدادیں ہیں۔ لہذا بالآخر ایک "شے" استعدادوں کا مرکب ہے جو کسی نہ کسی طرح یکجا ہو گئی ہیں۔ یہ موجود استعدادیں کیسے متصور ہوں گی۔ اس کا ایک ہی قابل فہم طریقہ ہے کہ ان استعدادوں کو اعمال مستقبل کے بارے میں ایک ذہن (Mind) کے فیصلے قرار دیا جائے۔ یوں عدم محض سے تخلیق متصور ہو سکتی ہے۔

"قوۃ" فعل کیسے بن جاتی ہے ہم نہیں جانتے۔ بعض شرائط پوری ہو جاتی ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ "قوۃ" (استعداد) فعل (واقعیت) میں تبدیل ہو گئی اور شے نابود' وجود میں آگئی۔ یہ ہمارا روز کا تجربہ ہے۔ ضروری شرائط کا موجود ہو جانا عمل ہے جو قوۃ (استعداد) کو فعل (واقعیت) میں لے آتا ہے اور یہ واقعہ بن جاتی ہے۔ پس حقیقت یا واقعیت بنیادی طور پر "عمل" ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عمل۔ اس کا تخلیقی عمل جو تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ وہ اشیا کو ان کا وجود' ان کی حقیقت' استعداد سے واقفیت تک ان کا "گزر" عطا کرتا ہے۔ یہی اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ ہے۔

اس تجزے کی رُو سے تمام حقیقت عمل ہے۔ اذہان (Minds) عمل ہیں' فی الاصل یہ سب خدا کا عمل ہے۔

لیکن محسوس سے تجاوز کرنے اور اللہ کی ماہیت کو عمل کہنے میں ہم محفوظ بنیادوں پر نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ کی ماہیت کے سوال سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ ہم اُسے نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ اشیاء کو جوہریت' حیات' ازخود حرکت اور شعور بھی عطا فرماتا ہے۔ در حقیقت اختیار (کرنے اور نہ کرنے کی صلاحیت) یہی نہیں بلکہ شعور کا شعور بھی اختیار ہے۔ در حقیقت فعل اور ترک فعل کی صلاحیت عطائے محض اور ذہن ایک نمیت ہے جو اپنی ذات کے شعور سے متصف ہے۔

تخلیق اور عقلیت

انکارِ تخلیق کی بنیاد عقلیت ہے۔ زمان (Time) عقلیت سے خارج ہے کیونکہ عقلیت کے لئے ترقی ایک تصور کا انتزاع ہے دوسرے تصور سے۔ پائیدار' دائمی اور مثبت۔

لہٰذا کسی چیز کا تصور (وجود) ہونا چاہیے جس سے انتزاع واقع ہوگا۔ ایسے تصور کے بغیر کوئی انتزاع کوئی ارتقا ممکن ہی نہیں۔ کوئی شے ہونی چاہیے جس سے کوئی چیز منتزع کی جا سکے۔ عدم سے صرف عدم منتزع ہو سکتا ہے یعنی "لاشے" سے "لاشے" ہی کو منتزع کیا جا سکتا ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ نچلی سطح پر دوام و استمرار' عدم تغیر مادہ (Mass) اور حرکت (Motion) بحیثیت اصول توجیہ کے عقلیت کی احتیاج ہے۔

اب جوں ہی "زمان" داخل ہوتا ہے حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔ ہر تغیر

ایک ایسا نیا پہلو' ایک ایسی نئی کیفیت وجود میں لاتا ہے جو اس عالم میں تھی ہی نہیں۔ حتیٰ کہ کمیتی تغیر اور اس سے بھی بڑھ کر نوعیتی تبدیلی' جیسے غیرنامی میں "نمو" کا ظہور اس سے بھی بڑھ کر "شعور" کا ظہور اور تصورات و جذبات وغیرہ نئے پہلوؤں کا وجود میں آنا' بہت ہی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہی تخلیق ہے۔ کم از کم صفات (Qualities) کا وجود میں آنا۔ یہی "جوہر" کا وجود میں آنا بھی ہے۔ یوں ظاہر یہ ہوتا ہے کہ تخلیق ایک عمل ہے زمان میں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے عمل زمان میں صادر ہوتے ہیں اور زمان کی کوئی جگہ جیسے وجود ذی شعور میں ہے وجودِ باری میں نہیں ہے۔ عقلیت کو اس سے انکار ہے اور اصولاً ہونا چاہیے کیونکہ عقلیت کا خدا ایک تصور ہے لیکن یہ کسی طرح واضح نہیں ہوتا کہ مذہب اس کا انکار کیوں کرے۔

کیا زمان کے اندر صدورِ فعل میں کوئی نقص مضمر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مذہب بھی اس کا انکار کر سکتا۔ لیکن یہ واضح نہیں کہ زمانہ میں فعل کا صادر ہونا نقص ہے۔

قابلِ فہم کائنات اور زمان

یہ وہ کائنات ہے جو صرف متصور ہو سکتی ہے۔ ادراک بالحواس کا منظور (Object) نہیں بن سکتی۔

اس تصور میں دو محرک (Motive) اثرانداز معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ عقلیت

۲۔ مذہب

۱۔ عقلیت

عقلیت کا ارادہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کو خالصتہ عقل کی ملکیت قرار دے۔ جہاں تک تصورات یا ذہنی حقائق کا تعلق ہے انسان اسے سمجھ سکتا ہے۔ قابلِ فہم

کائنات، ادراک بالحواس کا منظور نہیں بن سکتی۔ یہ زمان و مکاں سے ماورا ہے تو پھر اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ محض فکری طور پر صحیح (Valid) ہونے کی مصداق ہے۔

مذہب:

مذہب کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ماورا ہے، مدرک بالحواس نہیں ہے اسے قابل تعقل کائنات کا جزو بنا دیں تو وہ موجود ہو جاتا ہے اور قابل تعقل بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہ زمان و مکان سے ماوراء ہے پھر بھی موجود فی الخارج ہے۔ ماورائی انا (Transcindental Ego) جس کی حیثیت ناظر (Subject) کی ہے وہ بھی اسی قابل فہم کائنات سے تعلق رکھتی ہے اور اس لئے وہ ورائے زمان و مکاں ہے۔ پھر بھی موجود فی الخارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمان انا کے وجود کے باہر متصور ہوتا ہے کیونکہ انا کو قابل تعقل عالم میں رکھنا ہوگا۔ غیرزمانی صحت (Validity) کو ہم سمجھتے ہیں مگر کیا غیرزمانی وجود کو ہم کوئی معنی بھی دے سکتے ہیں۔ ہم غیرزمانی وجود خارجی کو نہیں سمجھتے۔ وجود خارجی ہمارے لئے زمان کے پھیلاؤ میں صرف ایک دوراں (مدت) ہے اور کچھ نہیں۔

وجود ورائے زمان کے صرف یہ معنی ہیں کہ وجود مرور زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہرگز لازمانیت (Non Temporality) کے نہیں جو کلی (Universal) کی خصوصیت ہے۔ جزوی موجود فی الخارج خواہ وہ اللہ تعالیٰ ہو خواہ انا (Ego) زمان میں بھی ہے اور بیک وقت ورائے زمان بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مرور زمانہ سے متاثر نہیں ہوتے۔

قدم (Eternity)

قدم صرف ہمیشہ کے لئے وجود مسلسل نہیں ہے۔ بلکہ ایک صفت ہے غیرزمانی وجود کی' جس کا ہمیں کوئی تصور نہیں۔ اور یہ کہ تمام مذاہب اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا قدم الہیات (Theology) نے فلسفہ سے لیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفے سے' جس میں خدا کا تصور یہ ہے کہ خدا ایک فکر ہے جو اپنے ہی فکر میں منہمک ہے جس کی حیثیت محض قابل تعقل تصور کی سی ہے جو مذہب کے زیر اثر "بسیط" سے "مرکب" بن گیا ہے۔ لہٰذا اس معنی میں قدم کا تصور مذہبی نہیں' فلسفیانہ ہے۔ حیات بعد الموت کی نوعیت دنیا کی زندگی سے مختلف ہوگی جو مذہب کا موقف ہے مگر اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ غیرزمانی ہوگی۔

خلاصہ

۱۔ اگر علم بالوحی علم الغایات ہو تو بنیادی تصور "فضل و کمال" ہو گا۔ اگر علم بالوحی حقیقت کا علم ہو تو بنیادی تصور وجود ہو گا۔

۲۔ اگر علم بالوحی غایات کا علم ہو تو توحید و شرک کا تعلق انسان سے ہو گا اور شرک حصول غایت میں مانع ہو گا۔ اگر علم بالوحی حقیقت کا علم ہو تو شرک و توحید کا تعلق انسان سے نہیں حقیقت سے ہو گا۔

۳۔ اگر علم بالوحی علم الغایات ہو تو نتیجہ خیزی کی ضمانت بھی اسی میں ہو گی اور معجزہ کار قیادت غیر ضروری ہو جائے گی۔ اگر علم بالوحی حقیقت کا علم ہو تو نتیجہ خیزی کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔

۴۔ اگر علم بالوحی حقیقت کا علم ہے تو حصول غایت کا لائحہ عمل اور جہاد غیر ضروری ہو جائے گا۔ اگر علم بالوحی علم الغایات ہو تو لائحہ عمل اور جہاد ضروری ہو گا اور بین الاقوامی سطح پر زندگی کے عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ و رجنگ کا مظہر ہونے کے باعث قتال ضروری ہو گا۔ اگر علم بالوحی کو علم حقائق تصور کریں تو ہست (IS) اور باید (Ought) کے تضاد کے رفع ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے اگر علم بالوحی کو علم الغایات تصور کریں تو علم الغایات کا وظیفہ یہی ہو گا کہ وہ ہست (IS) کو باید (Ought) کے تقاضے کے مطابق ڈھال سکے۔ جب سے ہم نے علم بالوحی کو حقائق کا علم سمجھا ہے' علم بالوحی سے تخلیق نتائج کی آرزو کا پورا ہونا ناممکن نظر آنے لگا ہے۔

باب ۱۱

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ○

زاویۂ نگاہ یا موقف

زاویہ نگاہ یا موقف سے مراد وہ مقام یا حیثیت ہے جہاں سے ہر چیز اور تمام اعمال کو دیکھا جائے اور جس کے تعلق میں چیزوں کا "اعمال کا اور افراد کا معائنہ کیا جائے اور تخمینہ لگایا جائے۔"

اس زاویہ نگاہ کے بغیر نہ اِنفرادی زندگی' جو مجموعہ' اضداد ہے اور فکری' ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں پر مشتمل ہے اصلاح پذیر نہیں ہو سکتی کیونکہ فکری پہلو کے متعلق بے مقصدی کو مقصدیت میں بدلنا درکار ہے ایمانی پہلو کے تعلق میں تذبذب کو کامیابی کی نسبت ایمان بالغیب میں بدلنا ضروری ہے اور اخلاقی پہلو میں خواہشات کی بے انضباطی کو ضبط و انقیاد میں بدلنا ضروری ہے۔ یہ تبدیلی انسان مرتضیٰ بننے کے نصب العین کی جدوجہد کے ضمن میں لائی جا سکے گی۔ اور اس زاویہ نگاہ کو اختیار کرنے کے بغیر وہ ولولہ اور وہ تعاون پیش کرنا ناممکن ہو گا جو حصول نصب العین کے لئے ضروری ہے۔

اس زاویہ نگاہ کے اختیار کئے بغیر ہماری زندگی کی اِصلاح نہیں ہو سکتی جو اپنی خاصیت میں اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے اور جس کے تین پہلو ہیں۔ معاشرتی' معاشی اور سیاسی۔ یہ پہلو بھی مثالی معاشرے کے قیام کو نصب العین بنا کر اس کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں اصلاح پذیر ہوں گے کیونکہ معاشرتی پہلو میں نسلی تفاخر اور خودپسندی کو اخوت میں بدلنا درکار ہے اور معاشی پہلو میں حرص' لالچ اور بخل کو انفاق' ایثار اور احسان میں بدلنا ضروری ہے۔ اور سیاسی پہلو میں ہوس اقتدار کے بجائے کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کا عمل میں آنا ضروری ہو گا جس کے بغیر سیاسی تناقض (Political Antinomy) کا رفع ہونا ناممکن ہو گا۔ بین الاقوامی

زندگی جو عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ و رجنگ کا مظہر ہے' غلبہ دین حق کی بدولت امن و عافیت سے ہمکنار کرنا ضروری ہے۔ ہر مرحلے پر جو ولولہ اور جو تعاون کامیابی کا ضامن ہے وہ رحمتہ للعالمینی ہی کے زاویہ نگاہ سے میسر آسکتا ہے۔

رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ بالقوہ فطرت کی نشوونما میں جو مزاحمت جبلی داعیات' طبیعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کے تحت پیش آئے گی اس پر غالب آنے کے لئے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؁ کے حکم کے تحت حاصل ہوگا۔

ہر انسان "رحمت" کا طلب گار ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے معاملے پر رحمت کی نظر کی جائے۔ اگر وہ خطا کار ہو تو اسے معاف کیا جائے۔ اگر وہ کمزور ہے تو اس پر رحم کیا جائے۔ اگر اس میں کوئی کوتاہی ہے تو اس سے صرف نظر کیا جائے۔ اگر وہ حاجت مند ہے تو اس کی احتیاج پوری کی جائے۔ اگر اس میں کوئی نقص ہے تو اسے نظرانداز کیا جائے۔ اگر وہ گنہ گار ہے تو اس کے گناہ سے چشم پوشی کی جائے۔ اگر وہ بے سہارا ہے تو اسے سہارا دیا جائے۔ یہی طرز عمل اسے نیکی کا ولولہ عطا کرے گا اور ہر کار خیر میں اپنا تعاون پیش کرنے کے قابل بنا دے گا۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴿الزمر:۵۳﴾

(کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ سب خطائیں معاف فرما دے گا۔ بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔)

کا اعلان جانفزا ہی نقص سے نکل کر کمال پر فائز ہونے کے یقین کی بنیاد ہے۔

اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتہ للعالمین بنا کر بھیجا گیا۔ "ستدار

دشمناں" آپ ﷺ کا لقب ہے طائف کی تبلیغ کے جوابی ردِ عمل' مکی زندگی کی مقہوریت اور مغلوبیت سے لیکر فتح مکہ تک کے اعلان تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر طرزِ عمل رحمتہ للعالمینی کا علمبردار ہے اور آپ ﷺ کا اسوۂ مبارک انتہائی اثر و نفوذ کا آئینہ دار ہے۔

لہٰذا حیات انسانی' جو انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی پہلوؤں کو محیط ہے۔ عروج و زوال کی مصداق ہے اور زوال ہو تو اس زوال سے نکلنا کسی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں اس لئے انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے نصب العین جو سورۂ فاتحہ کی اھدنا الصراط المستقیم کے محتوی (Content) کی حیثیت رکھتے ہیں' جس میں مہبطِ وحیِ قرآنی کے ساتھ ماضی' حال اور مستقبل کے تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ جس سے مقصودِ بعثت کو پانے کی صراط مستقیم مراد ہے جس کو شرف قبولیت حاصل ہونے کے نتیجے میں پیغمبرانہ جدوجہد کی بدولت انسان بے مقصدی سے نکل کر مقصدیت پر' حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت تذبذب سے نکل کر یقین راسخ پر' اجتماعی زندگی کے معاشرتی پہلو میں نسلی تفاخر اور خود پسندی سے اخوت پر' معاشی پہلو میں حرص و لالچ اور بخل سے نکل کر انفاق و ایثار اور احسان پر اور سیاسی پہلوؤں میں ہوسِ اقتدار کے نتیجے میں سیاسی تناقض لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ سے نکل کر کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی پر اور بین الاقوامی زندگی میں مغلوبیت اور مقہوریت سے نکل کر غلبہ دین حق کے نصب العین پر فائز ہوا۔ اس کے لئے ہر نصب العین کے حصول کے ضامن لائحہ عمل کی صورت میں جو ہدایت میسر آتی ہے اس کو سمجھنے کی سعی کی جائے۔

انفرادی زندگی کا نصب العین

حیات انسانی عبارت ہے مقصد کے شعور اور اس کے حصول کی جدوجہد ہے۔ نصب العین یا غایت قصویٰ وہ منتہائے مقصود ہے جس کو حاصل کرنے کی جدوجہد سے ہر کمال وابستہ ہے۔

انفرادی زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین انسانِ مرتضیٰ یعنی ایسا انسان بننا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی رضا (خوشنودی) حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار انسان کے لاشعور میں موجود ہے۔ شعوری سطح پر یہ اقرار دو حالتوں میں شدت اختیار کرتا ہے۔ ایک اس وقت جب انسان کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہو جسے وہ تائید و نصرت الٰہی کے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو۔ دوسرے اس وقت جب انسان کسی ابتلا میں پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے اس کے دل و ذہن اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کا فضل طلب کرنے کی طرف مائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کا فضل میسر آنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرے۔

زندگی میں ہر اچھی تبدیلی ہمیشہ کسی بلند پایہ ولولہ انگیز نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے۔

فطرت انسانی میں بالفعل فطرت اور بالقوہ فطرت کی ثنویت اور اس ثنویت کے باعث دونوں پہلوؤں کے درمیان تضاد کی وجہ سے زندگی میں عروج و زوال کا امکان موجود ہے۔ جاننا چاہیے کہ عروج کیا ہے؟ زوال کیا ہے؟

نصب العین کا واضح تصور حصول نصب العین کے لئے تنظیم کی احتیاج کا شعور نظام فکر و عمل کی روح یعنی یقین، حصول غایت کی جدوجہد کے دوران پیش

آنے والی مزاحمت کی مزاحمت کے نتیجے میں زندگی کا مقصدیت اور حصول مقصد میں کامیابی کے یقین اور فضائل اخلاق سے مزین ہو کر مقصد کے قریب تر ہوتے جانا عروج ہے اور زوال نام ہے۔ غایت کے تصور کے خیرہ ہو جانے' تنظیم کی احتیاج کے شعور کے مٹ جانے' نظام فکر و عمل کی رُوح کے فنا ہو جانے اور اختلال انگیز مواثرات کے جواب میں قومی کردار کی حفاظت نہ کر سکنے کا۔

انسانی فطرت کے دو پہلو(ا)

بالفعل فطرت جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل ہے جو اپنی تکمیل بغیر کسی قید کے چاہتے ہیں اور بالقوہ فطرت فجور و تقویٰ کے امتیاز ربوبیت کے اقرار' اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی استعداد ہے جو نشوونما نہ پا سکے تو اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسی پہلو کو نشوونما دے کر اسے ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت کو منضبط اور منقاد بنانے کے لئے انبیاء کی بعثت ہوتی رہی ہے تا کہ انسان کمال پر فائز ہو سکے۔

انفرادی زندگی کے کمال پر فائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ نصب العین بھی علم بالوحی سے متعین ہو جس کے حصول کی جدوجہد سے فرد کمالِ انسانی پر فائز ہوگا اور اس نصب العین کے حصول کی رہنمائی بھی علم بالوحی سے میسر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی نسبت قرآن کا دعویٰ ہے:

(ا) ان کی وضاحت باب اول میں تصورِ کائنات کی بحث میں کی جا چکی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○

﴿المزمل:۱۹﴾

یہ تو نصیحت ہے سو جو چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ ۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿الجاثیہ:۲۲﴾

اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے تا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿یٰسین:۱۱﴾

تم تو صرف اس شخص کو نصیحت کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور خدا سے غائبانہ ڈرے سو اس کو مغفرت اور بڑے ثواب کی بشارت سنا دو۔

انسان مرتقی بننے کی جدوجہد سے انفرادی زندگی کے فکری، ایمانی، اخلاقی تینوں پہلو اصلاح پذیر ہوں گے۔ فکری پہلو کی اصلاح طلب خاصیت زندگی اور کائنات کو بے مقصد سمجھنا ہے اور اس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ زندگی اور کائنات دونوں کے بارے میں مقصدیت کا یقین راسخ ہو۔

ایمانی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت یہ تذبذب ہے کہ حصول مقصد کی

جدوجہد میں کامیابی ہوگی یا نہیں؟ اور اس کی اصلاح پذیری حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت ایمان بالغیب کا راسخ ہونا ہے کیونکہ جو نتائج ابھی غیب میں ہیں ان ہی کے حاصل ہو کر رہنے کا یقین ایمان بالغیب ہے جو جدوجہد سے پہلے نہ ہو تو جدوجہد نہیں ہوسکتی اور اس ایمان کی اساس کائناتی قوانین کے باہمی ربط میں مضمر ہے جس کی وضاحت تصورِ کائنات (باب اول) اور قرآن تاریخ ہے (باب دوازدہم) میں کی گئی ہے۔

اخلاقی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت' خواہشات کا بے انضباط اور بے انقیاد ہونا ہے اور اس پہلو کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ خواہشات ضبط و انقیاد کی پابند ہو جائیں۔

علم بالوحی کی رُو سے فضائل اخلاق کا معیار اخلاقی حکم ہے جس کو فاعل اخلاق بہ اختیارِ خود اپنے اوپر اس لئے نافذ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حکم کو بالذات واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ اخلاقی حکم کی تعمیل میں نفس انسانی کا مزاحم ہونا اخلاقی اصلاح کی ایک سازگار شرط ہے۔ جب وہ اس مزاحمت کی مزاحمت رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے تو اخلاقی کمال پر فائز ہوتا ہے۔

جب انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر راضی ہونے کی کیفیت پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندے سے ضرور راضی ہو۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ج فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ لا وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿الفجر: ۲۷-۳۰﴾

اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ

چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے ممتاز
بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

جو چیز اس جدوجہد میں انسان کو استقامت بخشتی ہے وہ ایمان بالآخرت ہے۔ آخرت یعنی مرنے کے بعد زندگی' اعمال کی بازپرس' جوابدہی' جزا اور سزا' جنت اور دوزخ ہونی چاہیے۔ یہ تقاضا بجز ظالموں اور غاصبوں کے ہر انسان میں موجود ہے۔ کیونکہ کوئی انسان یہ نہیں چاہتا کہ حیات ارضی میں انسانوں کو جس ظلم سے واسطہ پڑتا ہے وہ بغیر دادرسی کے اور نیکی بغیر اجر کے اور بدی بغیر مکافات عمل برباد چلی جائے۔ لہذا آخرت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالٰی نے اخلاص باللہ کا انعام اور عناد باللہ کا انتقام آخرت پر ہی ملتوی فرمایا ہے اور حیات ارضی میں یہ مہلت دی ہے کہ انسان اصلاح پذیر ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ اگر توبہ نہ کی جائے تو اعمال بد کے جو نتائج قبل از مرگ زندگی میں مرتب نہیں ہو سکے ان کی سزا آخرت میں مل کر رہے گی۔

اللہ تعالٰی کے نامشہود ہونے کی صورت میں اللہ پر اور آخرت پر ایمان کی حیثیت ایمان بالغیب کی ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بغیر اخلاقی جدوجہد میں جان دینے کا ولولہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جان قربان کرنے کا ولولہ تب ہی پیدا ہوتا ہے جب یہ یقین ہو کہ خدا کی راہ میں جان قربان کرنے سے زندگی برباد نہیں جائے گی۔

رضائے الٰہی کے مطابق زندگی کے ڈھل جانے کی شہادت یہ ہے کہ:

- ایمان باللہ انسان کے جبلی داعیات پر غالب ہو جو اسے خواہش کے مقابلے میں جادۂ استقامت سے منحرف نہ ہونے دے۔

۲۔ طبعی خواہشات پر یہ تاریخی تجربہ غالب ہو کہ کامیابی ضبط و انقیاد سے حاصل ہوئی تھی۔

۳۔ نفسیانی تقاضوں پر یہ شعوری تقاضا غالب ہو کہ ہر کامیابی کے لئے فضائل اخلاق ضروری ہیں۔

اگر یہ تینوں شرطیں پوری ہوں تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر انسان ثابت قدم رہ سکے گا اور اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئے گی۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ ﴿مزمل:۱۹﴾

انفرادی زندگی کے نصب العین کا لائحہ عمل

لائحہ عمل کیا ہوتا ہے؟

لائحہ عمل پہلے سے متعین کیا ہوا فرائض و اعمال کا وہ گوشوارہ ہے جس میں نصب العین کو پانے کی ضمانت ہو۔ لائحہ عمل کی احتیاج اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ انفرادی زندگی کے تینوں پہلوؤں کی اصلاح میں کچھ موانع ہیں جن کا تدارک ضروری ہے۔ جب تک علم بالوحی کو جس کا وظیفہ تخلیق نتائج ہے' ماہیت کا علم سمجھا جاتا رہے گا' اس وقت تک نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں انفرادی زندگی کے فکری' ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی مطلوبہ اصلاح میں درپیش موانع کے تدارک کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے گا اور افراد اپنے اندر مثالی معاشرہ کے ارکان بننے کی اہلیت پیدا نہ کر سکیں گے اور معاشرہ وجود میں آ بھی جائے تو وہ غلبہ دین کے قیام کی ذمہ داری ادا نہ کر سکے گا۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ افراد انسان مرتضٰی بننے کے نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں فکری' ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح طلب خاصیت پر غالب کیسے آئیں گے؟ بہ الفاظ دیگر نہیں مقصدیت کا یقین کیسے آئے گا؟ حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کا یقین کیسے آئے گا؟ اور خواہشات کو ضبط و انقیاد کا پابند بنانے

کے لئے موانع کا تدارک کیونکر کیا جاسکے گا تا کہ افراد انسان مرتضٰی بن جانے کے کمال پر فائز ہوسکیں۔

اس کی شرط یہ ہے کہ فطرت انسانی کے بالقوہ پہلو کو نشوونما دے کر ایک زندہ طاقت بنایا جائے اور اس کے تحت بالفعل فطرت یعنی جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو منضبط اور منقاد بنایا جائے۔ اس کے لئے کائناتی قانون نشوونما تصدیق و تکذیب کا تضاد ابھارنا ضروری ہوگا۔ جب تک خواہش اور فرض کا تضاد نہ ابھرے، اخلاقی محل پیدا نہیں ہوتا۔ فرض عبارت ہے کسی "حکم" کے واجب التعمیل ہونے کے شعور سے اور خواہش فرض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہے۔ جب اخلاقی عمل وقوع میں آتا ہے یعنی فرض اور خواہش میں کشمکش پیدا ہوتی ہے تو غوروخوض کی نوبت آتی ہے کہ خواہش کو پورا کیا جائے یا فرض کو۔ پھر دونوں میں سے ایک نیت کو انتخاب کرنا ہوتا ہے یعنی تکمیل خواہش کی نیت یا فرض کی انجام دہی کی نیت۔ پھر دونوں میں سے کسی ایک نیت کی تائید میں عزم کیا جاتا ہے۔ پھر تعمیل کی نوبت آتی ہے پھر نتیجہ فعل ظاہر ہوتا ہے۔ اخلاقی محل (Moral Situation) میں صادرشدہ فعل کی نیت پر اخلاقی فیصلہ (Moral Judthment) صادر ہوتا ہے۔ انما الاعمال بالنیات کا یہی مطلب ہے۔ یعنی "مقصود" نہیں "حکم" معیار ہے۔ مقصود کے معیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس فعل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہوگا۔ جس سے مقصود حاصل نہ ہو وہ بدی ہوگا۔ یہ معیار "مصلحت کوشی" کو نیکی بنا دیتا ہے۔ بخلاف اس کے علم بالوحی کی رو سے "حکم" معیار ہے۔ یعنی اخلاقی حکم کو واجب التعمیل سمجھتے ہوئے جو فعل حکم کی بجاآوری کی نسبت سے صادر ہو وہ نیکی ہے اور جو فعل حکم کی خلاف ورزی کی نیت سے صادر ہو وہ بدی ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝

﴿المائدہ:۴۴﴾

اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے
تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

﴿المائدہ:۴۵﴾

اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے
تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

﴿المائدہ:۴۷﴾

اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے
تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

اختیار

انسان کا اپنے ارادے میں انتخاب نیت کی حد تک صاحب اختیار ہونے پر اس کی اخلاقی ذمہ داری منحصر ہے۔ اختیار کے ایجابی معنی یہ ہیں کہ جسے مختار کیا جائے اُس میں فی نفسہ اتنی آزادی موجود ہو کہ وہ اپنی عملیت کو خود متعین کر سکے۔ اور اس کے سلبی معنی یہ ہیں کہ اُس کے اعمال پر کسی قسم کا بیرونی تشدد یا اندرونی جبر موجود نہ ہو۔ اللہ نے انسان کو کمال اخلاقی کی تمنا اور فضل خداوندی کی تلاش کے

لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے انسان کو ضرور صاحب اختیار ہونا چاہیے۔

نفس کی بصیرت

اپنے اعمال کی ذمہ داری کا شعور انسان کی فطرت میں جاگزیں ہے۔ وہ اپنی اخلاقی فطرت کی بناء پر یہ بصیرت رکھتا ہے کہ اس کے عمل کی حیثیت کیا تھی یعنی اُسے خوب معلوم ہے کہ صدورِ فعل کے وقت اس کی نیت اخلاقی حکم کی بجا آوری تھی یا خلاف ورزی کی، اور اس کا ضمیر اس فیصلے میں کبھی غلطی نہیں کرتا جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ○

﴿القیامہ: ۱۴:۱۵﴾

بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے اگرچہ عذر و معذرت کرتا رہے۔

احسن تقویم

انسان کی تخلیق بہترین ساخت پر ہوئی ہے جیسا کہ اس آیت پاک سے ظاہر ہوتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ﴿التین: ۴﴾

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔

اور بدی اور نیکی کا امتیاز نفس انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۔ ﴿الشمس: ۷﴾

انسان کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔

انسان کا عمل جیسا بھی ہو وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کے "لاشعور

میں "خیر" ہے لیکن بالفعل فطرت یعنی جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کے تحت وہ شعوری سطح پر اپنی فطرت خیر سے انحراف کرتا ہے۔

نفسِ انسانی کے دو پہلو

نفس انسانی کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ نفس اسفل اور ۲۔ نفس اعلیٰ

نفس اسفل کو قرآن مجید میں "نفس امارہ" کہا گیا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ﴿یوسف:۵۳﴾

بے شک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔

نفس امارہ خواہشات کی بے قید تکمیل پر مصر ہے۔

نفس اعلیٰ کی دو حالتیں ہیں۔ ایک وہ جب نفس امارہ مطیع نہیں ہوا تو اس کی سرکشی پر فائل اخلاق کو اس کا نفس اعلیٰ ملامت کرتا ہے۔ اس حالت کو قرآن مجید میں "نفس لوامہ" سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿القیامہ:۲﴾ نفس امارہ کی سرکشی سے نفس لوامہ اذیت میں رہتا ہے اور دوسری حالت وہ ہے جس میں اذیت سے رہائی میسر آئی ہے جس کی شرط یہ ہے کہ نفس امارہ' مطیع و منقاد ہو جائے تو نفس لوامہ' نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جس کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے۔

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۙ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۚ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿الفجر:۲۷'۲۸'۲۹'۳۰﴾

"اے نفس مطمئنہ تو لوٹ جا اپنے رب کی طرف یوں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے۔"

نفس امارہ کا انسان کی اخلاقی جدوجہد میں رکاوٹ بننا اس کی اخلاقی نشوونما کی ایک سازگار شرط ہے کیونکہ جو مزاحمت نفس پیدا کرتا ہے اس سے عزم خوابیدہ بیدار ہوتا ہے اور مزاحمت کی مزاحمت سے اخلاقی کمال حاصل ہوتا ہے۔

روحانی الذہن افراد

روحانی الذہن افراد ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے وجود میں آتے ہیں۔ دراصل اللہ کا یقین انسان کے لاشعور میں جاگزیں ہے۔ وحی قرآنی سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ایک مستجمع صفات وجود کے ساتھ انسان کی نسبت عبدیت استوار ہونی چاہیے جس کا حق یہ ہے کہ ہم اس کی طرف سراپا نیاز ہو کر متوجہ ہوں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ۙ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ ﴿البقرۃ:۲۲﴾

"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو اور جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا اور پھر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے۔ پس کسی کو جان بوجھ کر اللہ کا ہمسر نہ بناؤ۔"

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ

هِىَ الْمَاْوٰى ۝ ﴿النازعت: ۴۰،۴۱﴾

"اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔"

اللہ کا خوف ایک محرک ہے جو ایمان کی بدولت پیدا ہونے والی محبت کا نتیجہ ہے جس کی طرف اِس آیت قرآنی میں اشارہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط ﴿البقرہ:۱۶۵﴾

"اور وہ جو ایمان لائے اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔"

یہ خوف خواہش نفسانی کی بے قید تکمیل سے روکتا ہے کہ ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہو۔ یہی للہیت ہے۔ للہیت سے متعین ہونے والا عمل، عمل صالح ہے۔ اللہ پر ایمان فعل اخلاقی کے صدور کے وقت خواہش نفسانی کے مقابلے میں نیکی پر استقامت بخشتا ہے۔

اخلاقی کشمکش کے موقعہ پر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس اخلاقی حکم کے اتباع کی نیت محرک عمل ہے اور ایمان جن اعمال کا متقاضی ہے اور وہ جن احکام سے متعین ہونے چاہیں صرف وہی قرآن مجید سے میسر نہیں آتے بلکہ وہ محرک بھی میسر آتا ہے جس کی بدولت استقامت نصیب ہوتی ہے۔ یہ محرک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و تکذیب کے تضاد پر مشتمل ہے۔ انسان کی اخلاقی تمنا کی تکمیل کی ضمانت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں میسر آتی ہے کیونکہ انسان آرزو رکھتا ہے کہ برائی سے بیزار ہونے کے بعد اسکے کیے ہوئے گناہ معاف ہو جائیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ ﴿الزمر:۵۳﴾

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ سب گناہ معاف فرمادے گا۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ﴿ھود:۱۱۴﴾

"کچھ شک نہیں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔"

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴿فرقان:۷۰﴾

"مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

لہٰذا انفرادی زندگی کے نصب العین (رضائے الٰہی کے حصول) کے لائحہ عمل کی بدولت زندگی پسندیدہ نمونے پر ڈھلے گی اور زندگی کے رضائے الٰہی کے نمونے پر ڈھلنے سے افراد میں وہ صفات یعنی اخلاقی جہد کی صلاحیت اور روحانی الذہن ہونے کا کردار پیدا ہوگا جو اجتماعی زندگی کے نصب العین کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ زندگی کے ان خصائص سے مزین ہونے کی شرط اس پروگرام پر عمل پیرا ہونا ہے جس میں منصب رسالت کے وظیفے کی وضاحت کی گئی ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ○

﴿البقرة:١٥١﴾

"جیسا کہ ہم نے تمہارے اندر تم ہی میں سے اپنا ایک عظیم الشان رسول برپا کیا جو تمہارے سامنے ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ تمہیں ایسی چیزوں کی تعلیم دے رہا ہے جنہیں تم بہ استعداد خود نہیں جان سکتے۔"

اس آیت پاک سے پیغمبرانہ قیادت کے چار وظیفے سامنے آتے ہیں:

١۔ تلاوت آیات

٢۔ تزکیہ

٣۔ تعلیم کتاب و حکمت اور

٤۔ تعلیم مالم تکونوا تعلمون

لہٰذا سوال یہ ہے کہ:

تلاوت آیات کیا ہے؟

تزکیہ کیا ہے؟

تعلیم کیا ہے؟

کتاب کیا ہے؟

حکمت کیا ہے؟ اور

مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ سے کیا مراد ہے؟

تلاوت آیات

ایمان لانے اور احکام الٰہی کی پیروی کی دعوت ایسے عقاید اور واجب التعمیل احکام کی پیشکش ہے جس کے نتیجے میں اہل ایمان کو کافروں کی جانب سے مزاحمت کی صورت میں ایسا نفسیاتی محرک میسر آتا ہے جو انہیں اپنے موقف پر استقامت عطا کرتا ہے جیسا کہ ان آیات سے واضح ہوتا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ﴿یونس:۱۵﴾

"اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں
تو وہ لوگ جنہیں ہماری ملاقات کی امید نہیں کہنے لگتے ہیں اس
قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں تبدیلی کر دو۔"

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ یَكَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ﴿حج:۷۲﴾

"جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے
تو اہل کفر کے چہروں پر ناگواری کے آثار تمہیں دکھائی دینے
لگتے ہیں اگر ان کا بس چلتا ہے تو یہ اہل ایمان پر حملہ آور ہونے
سے بھی نہیں چوکتے۔"

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا ﴿مریم:۷۳﴾

"جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے
تو اہل کفر اہل ایمان سے کہتے ہیں دیکھو ہم دونوں جماعتوں میں
سے کس کی معاشرتی حیثیت بڑھی ہوئی ہے اور کس جماعت
کے رکن زیادہ آب و تاب والے ہیں؟"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ
يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ج ﴿سبا:۴۳﴾

"جب ان کے سامنے واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے
ہیں تلاوت کرنے والا ہمیں باپ دادا کے مراسم عبودیت سے
روکنا چاہتا ہے۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوا ائْتُوْا
بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ ﴿جاثیہ:۲۵﴾

"جب ان کے سامنے واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ
کٹ حجتی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے
ہو تو ہمارے آباء و اجداد کو لے آؤ۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ لا
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ ﴿انفال:۳۱﴾

"جب ان کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ
کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام کہہ

سکتے ہیں۔ اس میں پہلوں کے قصے کہانیوں کے علاوہ آخر ہے ہی
کیا۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ﴿لقمان:۷﴾

"جب اس کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ
اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح کتراتا ہے کہ اس نے
ہماری آیات کو سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے کانوں میں ڈاٹ ہیں
تو اسے دردناک عذاب سے خبردار کر دو۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۗ ﴿احقاف:۷﴾

"جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو
اہل کفر حق کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ تو واضح جادو ہے۔"

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلاوتِ آیات کا ردِ عمل ان لوگوں پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ وہ شدید عداوت و مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تعلیم ان کے مزعومہ مفادات کے خلاف نتائج پیدا کرے گی اس لئے وہ اپنی آبائی روایات کا سہارا لے کر اس تعلیم کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ ﴿الطلاق:۱۱﴾

سکتے ہیں۔ اس میں پہلوں کے قصے کہانیوں کے علاوہ آخر ہے ہی
کیا۔"

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَیْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ○ ﴿لقمان:۷﴾

"جب اس کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح کتراتا ہے کہ اس نے ہماری آیات کو سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے کانوں میں ڈاٹ ہیں تو اسے دردناک عذاب سے خبردار کر دو۔"

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ؕ ﴿احقاف:۷﴾

"جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اہل کفر حق کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ تو واضح جادو ہے۔"

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلاوتِ آیات کا ردِ عمل ان لوگوں پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ وہ شدید عداوت و مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تعلیم ان کے مزعومہ مفادات کے خلاف نتائج پیدا کرے گی اس لئے وہ اپنی آبائی روایات کا سہارا لے کر اس تعلیم کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا○ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ ﴿الطلاق:۱۱﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف یاددہانی کرانے والا رسول بھیجا جو تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی تلاوت کرتا ہے تا کہ ان کی ذریعہ سے ایمان اور اعمال صالحہ والے افراد کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لایا جائے۔"

معلوم ہوا کہ ان آیات کی بدولت ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کو اندھیروں سے نجات ملتی ہے اور وہ روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے باقی رہنے اور کافروں کے مٹ جانے کی نشانت اس بات میں تھی اور ہے کہ یہ تعلیم اپنی نفع بخشی کی وجہ سے باقی رہنے کے لئے تھی اور ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ط ﴿الرعد:١٧﴾

"پس جو چیز انسانیت کے لئے نفع بخش ہوتی ہے تو زمین میں استحکام حاصل کر لیتی ہے۔"

مگر مفاد پرستی کا میلان "راضیۃ مرضیہ" کی کیفیت کے پیدا ہونے میں رکاوٹ ہے۔

تزکیہ

تزکیہ سے مراد غلط روی کے میلان پر قابو پانا ہے۔ تزکیہ وہ باطنی پاکیزگی ہے جو علم اخلاق اور مذہب کے لئے ضروری ہے۔ جب تک انحراف کے میلان پر غلبہ حاصل نہ ہو، علم میسر آتا ہے نہ اخلاق نہ مذہب۔ انسانی فطرت کا جو میلان "راضیۃ مرضیہ" کی کیفیت کے پیدا ہونے میں رکاوٹ ہے اس کا دور کرنا ہی تزکیہ ہے۔ تعلق باللہ انسان کی بالقوہ فطرت میں داخل ہے مگر نفس کا تزکیہ نہ ہونے سے اس تعلق کا

ادراک اس لئے نہیں ہوتا کہ خواہشات نفسانی حجاب بنی رہتی ہیں۔ یہ حجاب خدا طلبی کی راہ میں ایک سازگار شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے خوابیدہ عزم بیدار ہوتا ہے اور انجام کار وہ حجاب رفع ہو جاتا ہے۔

تزکیہ کی دو شرطیں ہیں۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصود کو اپنانا اور دوسری اپنا مال دوسروں کی زندگی سے معاشی تعطل کو دور کرنے کے لئے خرچ کرنا تا کہ وہ بھی مقصودِ بعثت کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کی استطاعت پیدا کر سکیں۔ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ○ ﴿اللیل: ۱۷تا۲۰﴾

"اتقی وہ ہے جو اپنا مال اپنے تزکیہ کے لئے دوسروں کو دیتا ہے۔"

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا ○ ﴿الشمس: ۹﴾

"بے شک وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ اور بخل سے پاک کیا۔"

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ﴿اعلیٰ: ۱۴﴾

"بے شک وہ فلاح پا گیا جس نے اپنا تزکیہ کر لیا۔"

قرآن مجید کی رُو سے اخلاقی فضیلت اور معیشت باہمی، جوابی، اضافی، مستثنائی وجوبی طور پر وابستہ ہیں۔ نیکی دوسروں کی معیشت کو بہتر بنانے کے بغیر متصور نہیں ہو سکتی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ○ ﴿آل عمران: ۹۲﴾

"تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس میں سے خرچ

نہ کرو جو تمہاری نظر میں پسندیدہ ہے۔"

گویا ذعل اخلاق کا انفاق اس کی نیکی ہے اور یہی نیکی انفاق سے مستفید ہونے والے کی معیشت ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ:۲۶۲)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال صرف کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد نہ کسی پر احسان رکھتے ہیں اور نہ کسی کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان کو کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (بقرہ:۱۷۷)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کے قبلوں

کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر یوم آخر پر' ملائکہ پر' کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لایا جائے اور اپنے مال کو' اس سے محبت کے باوجود' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں' محتاجوں اور غلاموں کے لئے خرچ کیا جائے۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر عمل کیا جائے اور نیک تو وہ ہیں کہ جب عہد کیا جائے تو اسے پورا کریں اور مشکلات اور مصائب اور جنگی حالات میں ثابت قدم رہیں۔ یہ لوگ صحیح معنی میں سچے ہیں اور یہی اہل تقویٰ ہیں:

تعلیم

تعلیم ملی تشخص کو برقرار رکھنے کا وہ عمل ہے جس کی بدولت امت کو دوام و استقرار میسر آتا ہے۔ اس کے مضمرات میں معلم' متعلم اور کتاب (جس کی حیثیت نصابِ تعلیم کی ہے) داخل ہیں۔

علم بالوحی حقیقت عالم خارجی ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت کا علم نہیں بلکہ علم الغایات کی حیثیت رکھتا ہے جس کا وظیفہ "تخلیق نتائج" ہے جس سے ہم اس وجہ سے متمتع نہیں ہو رہے کہ علم الغایات پر تفسیر' تعبیر' تاویل' توجیہ و تعلیل کا نقطہ نظر غالب آگیا ہے۔

انما بعثت معلما' صحیح مسلم کی حدیث ہے جس میں پیغمبرانہ انقلاب کے طریق کار کے معلم ہونے کی طرف اشارہ ہے جس سے ان تمام نتائج کے برآمد ہو کر رہنے کے بارے میں تجربی توثیق و شہادت کا چیلنج قبول کیا جا سکتا ہے جس کے قبول کرنے میں مصطلحات قرآنی کے مفہوم کو لغت کے حوالے سے متعین کرنے کا طرز

عمل حائل ہے جس کی بدولت "الکتب" کو صحف ماسبق سے متمیز نہ کیا جا سکا۔

کتاب

کتاب کے محتویات کی وضاحت منہاج میں "تبیین" کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ کتاب کے قرآنی مفہوم کی نشاندہی کرکے "کتاب" کے تجزیے پر منہاج القرآن کی تبویب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

حکمت

حکمت قرآنی تصورِ کائنات کے بیان پر مشتمل ہے جس کو سمجھنے سے یہ اعتماد بحال ہوتا ہے کہ یہ کائنات اپنی ساخت میں حصول غایات کی انسانی جدوجہد میں کامیابی سے تمام و کمال ہم آہنگ ہے۔

حکمت کے محتویات (Contents) یہ ہیں:

۱۔ خالق کائنات

۲۔ اس کا صفات کمال سے متصف ہونا

۳۔ اس کے ارادۂ تخلیق سے کائنات کا عدم محض سے وجود میں آنا

۴۔ کائنات کے مراتب وجود:

"شے" (تمثال) سے وجودِ طبعی تک

وجودِ طبعی سے وجودِ نامی تک

وجودِ نامی سے وجودِ شعوری (حیوانی) تک

وجودِ شعوری سے خود شعوری سے متصف وجودِ انسانی تک

۵۔ انسان اور کائنات

۶۔ انسان اور خالق کائنات کے درمیان نسبت عبودیت

۷۔ عبودیت کے کمال پر فائز ہونے کے لئے ہدایت

یہ ہے تلاوت' تزکیہ اور تعلیم' کتاب و حکمت پر مشتمل لائحہ عمل جس سے افراد اجتماعی زندگی کے نصب العین کو حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کر سکتے ہیں۔

حیات اجتماعی
کا
نصب العین

نصب العین کی ضرورت

انسانی زندگی اس حد تک فطرتاً عمرانی الطبع ہے کہ بغیر معاشرے کے انسان وجود میں آسکتا ہے۔ نہ باقی رہ سکتا ہے نہ ترقی کرسکتا ہے۔ بغیر معاشرے کے صرف مرسکتا ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ عمرانی الطبع ہے۔ جب عمرانی روابط کی خوش گواری ختم ہو جائے تو زندگی میں کشش باقی نہیں رہتی۔

اجتماعی زندگی کے تین پہلو ہیں:

معاشرت

معیشت اور

سیاست

اور فطرت انسانی میں بالقوہ اور بالفعل پہلوؤں کی ثنویت اور اس ثنویت کی وجہ سے تضاد کی بناء پر جب تک اجتماعی زندگی اپنے تینوں پہلوؤں میں اصلاح پذیر نہ ہو جائے زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے صحت مند ماحول میسر نہیں آسکتا۔

اجتماعی زندگی کے معاشرتی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت کا اس نسلی تفاخر اور اس کی خودپسندی ہے اور اس پہلو کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ نسلی تفاخر اور خودپسندی کی جگہ اخوت کا جذبہ پیدا ہو۔

معاشی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت حرص ولالچ اور بخل میں جتلا ہوتا ہے اور

اس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ حرص و لالچ اور بخل کے بجائے انفاق' ایثار اور احسان کا تقاضا غالب ہو۔

سیاسی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت ہوس اقتدار ہے کیونکہ جب معاشرہ منظم ہوتا ہے اور مطاع اور مطیع وجود میں آتے ہیں تو وہ سیاسی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ مطاع اور مطیع کے وجود میں آنے سے مطاع کو قانوناً یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مطیعوں سے جبراً بھی اطاعت طلب کر سکے۔ اگر اطاعت طلب کرنے کا محرک ہوس اقتدار ہو تو سیاسی تنظیم میں تناقض پیدا ہو جاتا ہے اور ایک ظالمانہ نظام وجود میں آتا ہے جس کے نتیجے میں مطالبہ حقوق محرک عمل بن جاتا ہے اور سیاسی تناقض (Political Antinomy) کا رفع ہونا ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ حقوق طلب کرنے والا بے نظامی کا مرتکب متصور ہوتا ہے اور جس سے حقوق طلب کئے جاتے ہیں وہ ظالم اور غاصب متصور ہوتا ہے اور یہ تصادم کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس صورت حال کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ فرائض کی انجام دہی یعنی ایتائے حقوق محرک عمل ہو۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب مطاع اور مطیعوں کے درمیان کلمہ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی وجود میں آئے جس کے نتیجے میں مطاع اور مطیع دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام یکساں واجب التعمیل ہوں۔

اجتماعی زندگی کے ان تینوں پہلوؤں کی اصلاح حیات اجتماعی کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں ہو سکتی ہے۔ اجتماعی نصب العین "مثالی ہیئت اجتماعیہ" کا وجود میں لانا ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ حیات اجتماعی اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ اجتماعی وحدت کے شعور کی بنیاد پر ایک ہی نصب العین کی وفاداری سے متعین ہونے والا یکسانی کردار ہو۔

نصب العین کا شعور اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی اصلی حقیقت غائی

ارادہ ہے۔ غایت ہی کے حاصل کرنے کے لئے زندگی منظم ہوتی ہے۔ غایت ہی کے حصول کی آرزو سے رجوع الی اللہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کا محتوی (Content) مقصودِ بعثت کو پانے کی صراط مستقیم ہے۔ مقصودِ بعثت غلبہ دین حق ہے جس کے لئے اجتماعی زندگی کے نصب العین کا حصول (مثالی معاشرے کا قیام) اس لئے ضروری ہے کہ مثالی معاشرہ ہی غلبہ دین حق کے لئے جدوجہد کر سکتا ہے۔

مثالی معاشرے کے خصائص یہ ہیں کہ وہ:

- نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔
- اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔
- جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔
- اس معاشرے کے استحکام کی اساس محمد رسول اللہ کی غیر مشروط اطاعت اور آپ سے غیر منقسم وفاداری ہو۔

نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہونا اس لئے ضروری ہے کہ پوری نوع انسانی کی بہبود کے لئے جدوجہد کی جا سکے اور اس معاشرے کی اپنی نفسیات محدود وفاداریوں پر منظم ہونے والے گروہوں کی عصبیتوں سے مبرا ہو۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ

﴿النساء:١﴾

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان سے

پیدا کیا۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کی رُو سے پوری نوع انسانی ابتدا میں ایک امت تھی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴿البقرہ: ۲۱۳﴾

"پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈر سنانے والے۔ اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری تا کہ وہ لوگوں میں ان اختلافات کا فیصلہ فرما دے اور کتاب میں اختلاف ان لوگوں نے ڈالا جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن حکم آ چکے آپس کی سرکشی سے۔ تو اللہ نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو وہ حق بات بتا دی جس میں جھگڑتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔"

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ ﴿یونس: ۲۰﴾

"اور سب لوگ ایک ہی امت تھے انہوں نے اختلاف پیدا

کرلیا۔"

ان اختلافات کا علاج اللہ پاک نے یہ کیا کہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ایک امت پیدا کی جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝ ﴿انبیاء:۹۲﴾

"بے شک یہ تمہاری ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی عبادت کرو۔"

رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ۝ ﴿النساء:۱﴾

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔"

اس معاشرے کا اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہونا اس لئے ضروری ہے کہ جب تک افراد ان خصوصیات کے حامل نہ ہوں وہ مثالی معاشرہ نہیں بنا سکتے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ ﴿ال عمران:۱۱۰﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کی خاطر پیدا کیے گئے ہو' نیکیوں کا حکم دیتے ہو' برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

⇦ اس معاشرے کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرماتا ہے:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ط وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿البقرة:۳۸،۳۹﴾

"پس آئے گی تمہیں میری طرف سے ہدایت۔ پس جو ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ خوف ہوگا نہ غم۔ اور جو انکار کریں گے اور جھٹلائیں گے میری نشانیوں کو وہ دوزخ میں جلنے والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

⇦ اس معاشرے اور افراد کو ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ کرنے کے لئے کوشاں ہونا اس لئے ضروری ہے کہ محدود وفاداریوں پر منظم قوی تر گروہوں کی بالادستی کمزوروں کے لئے خوف و غم کا موجب اور محدود وفاداریوں پر منظم معاشروں میں خود اُن کے اپنے افراد بھی کمزوروں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں اور جائز حقوق سے محروم کرتے ہیں کیونکہ مزعومہ مفادات تنگ سے تنگ تر دائروں میں محدود ہوتے چلے جاتے ہیں اس سے نجات دلانا مقصود ہے۔

⇦ ایسے معاشرے کا عالمی (بین الاقوامی) سطح پر غلبہ اس لئے ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصود یہی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴿الصف:۹﴾ ﴿توبہ:۳۳﴾

"اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ خواہ یہ بات مشرکوں

کو ناگوار ہو۔"

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ۝ ﴿فتح:۲۸﴾

"اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور دین حق کو غالب کرنے کے لئے خدا ہی کافی ہے۔"

یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۔ ﴿الصف:۸۔۹﴾

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کی روشنی نور کو مونہہ سے پھونک مار کر بجھا دیں حالانکہ خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔ وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر ﷺ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے، خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔"

(ج) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالص وفاداری کی بنیاد پر منظم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ صرف آپ ﷺ ہی پوری نوع انسانی کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اور وفاداری کا تقسیم ہو جانا اختلال کا موجب ہے اور "شرک فی النبوت" کا ارتکاب ہے جس سے معاشرہ اختلال کا شکار ہوئے

بغیر نہیں رہ سکتا۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ﴿اعراف:۱۵۸﴾

"آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔"

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ﴿سبا:۲۸﴾

"اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

☆ اور آپ ﷺ سے خاص وفاداری اس لئے ضروری ہے کہ ایک تو کسی اعلیٰ ترین وفاداری کے بغیر زندگی ضبط و انقیاد کی پابند نہیں بنائی جا سکتی۔ دوسرے وفاداری منقسم ہو تو کسی دوسرے فرد کی ایسی وفاداری جو فرقہ پرستی میں مبتلا کرے امت کو فرقوں میں تقسیم کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اجتماعی زندگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت باذن اللہ مطاع مطلق کی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿النساء:۶۵﴾

"اے رسول! تمہارے رب کی قسم وہ مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپس کے جھگڑے میں آپ ﷺ کو حکم نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ آپ ﷺ حکم فرمائیں اس سے اپنے اندر دل تنگی نہ

پائیں اور جی سے مان لیں۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط ﴿احزاب:۳۶﴾

"اور کسی مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو روا نہیں کہ جب اللہ اور رسول ﷺ کچھ فرمادیں تو انہیں اپنے معاملے کا کچھ اختیار رہے۔"

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج ﴿النسا:۸۰﴾

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ ہی کی اطاعت کی۔"

- ان خصائص کے حامل معاشرے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک ایسے قائد کی ہے جس کے ساتھ غیر منقسم وفاداری کی بنیاد پر معاشرہ اختلال سے محفوظ رہ سکتا ہے جن کے ذریعے وہ ہدایت میسر آئی ہے جس کی پیروی پر اس معاشرے کے قیام اور بقا اور اس کی ترقی کا انحصار ہے۔ جن کا مبعوث فرمانا مومنوں پر اللہ کا احسان عظیم ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ یوں متوجہ فرماتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ ﴿آل عمران:۱۶۴﴾

"بے شک اللہ کا مومنوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ان
ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات
تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و
حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بالضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی
میں تھے۔"

⇦ اگر مسلمان شرک فی النبوت میں مبتلا ہوں یعنی کسی اور فرد کو اس وفاداری میں شریک کرکے اس کی پیروی اپنے اوپر ویسی ہی لازم سمجھیں جیسی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ان کا فرقہ پرستی میں مبتلا ہو جانا ضروری ہو جائے گا۔

اجتماعی نصب العین کا حصول تب ہی متصور ہو سکتا ہے جب کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد ہو اور اس بنیاد پر غیرطبقاتی معاشرہ ہی وجود میں آسکتا ہے اور مختلف بنیادوں پر جو طبقات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سیاسی بالادستی اور زیردستی کے امتیاز پر طبقات اس لئے وجود میں نہیں آسکتے کہ کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے قیام کے نتیجے میں مطاع اور مطیعوں دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام کے یکساں واجب التعمیل ہونے اور فرائض کی بجاآوری یعنی ایتائے حقوق کے محرک عمل ہونے کے باعث سیاسی طبقات کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ معاشی طبقات یعنی عیش و عشرت میں بسر کرنے والوں' ضروریات زندگی پر قناعت کرنے والوں اور انتہائی عسرت و افلاس میں دن

گزارنے والوں کے درمیان طبقاتی امتیاز اس لئے باقی نہیں رہ سکتا کہ اخلاق اور معیشت کے باہمی' جوابی اور وجوبی طور پر مربوط ہونے کی بناء پر دوسروں کی معاشی نشوونما کے تعطل سے بے نیازی کسی بھی صاحب ثروت کو اسلامی معاشرے کی رکنیت کے خصائص سے محروم کر دیتی ہے۔ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مثالی معاشرے کے مبنی ہونے کے باعث نسلی اعتبار سے طبقات کی پستی اور بلندی کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ مفاد پرستانہ گروہ بندی سے جو طبقات پیدا ہوتے ہیں انہیں ختم کئے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اسلامی معاشرہ کلمہ طیبہ یعنی توحید و رسالت کے اقرار سے وجود میں آنے والی وفاداری' شرک فی التوحید اور شرک فی النبوت سے تقسیم نہ ہو تو طبقات پیدا ہوسکتے ہیں نہ فرقہ پرستی کا پیدا ہونا ممکن ہے۔

اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ ﴿الزخرف: ۴۴﴾

اجتماعی نصب العین کے حصول کا لائحہ عمل

مثالی معاشرے کے قیام' اس کی بقا اور ترقی جس لائحہ عمل سے وابستہ ہے اس کے تین مدارج ہیں:

۱۔ انسانی شخصیت کی نشوونما

۲۔ ہیئت عمرانی کی تکمیل

۳۔ ماحول کی تسخیر

انسانی شخصیت کی نشوونما

انسانی شخصیت کے چھ پہلو ہیں۔ ہر پہلو کے کچھ تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کی تکمیل میں کچھ موانع ہیں جن کو رفع کرنے کا اہتمام نہ ہو تو معاشرہ زوال میں مبتلا ہو کر انسانی سطح سے گر جاتا ہے۔ اس لئے شخصیت کے ہر پہلو کے تقاضوں کی تکمیل کی ذمہ داری صرف افراد پر ہی عائد نہیں ہوتی عمرانی اداروں پر بھی عاید ہوتی ہے۔ اور جب معاشرہ منظم ہو کر ریاست کی شکل اختیار کرتا ہے تو ریاست تمام اُن افراد اور اداروں کی نگرانی کی ذمہ دار بھی متصور ہوتی ہے جن کو شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشوونما کی ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے۔

حیاتی پہلو

شخصیت کے حیاتی پہلو کے تین تقاضے ہیں:

۱۔ خوراک

۲۔ لباس

۳۔ رہائش

ان کی تکمیل میں افراد کا حرص و لالچ اور بخل میں مبتلا ہونا حائل ہے۔ اگر افراد کے اس پہلو کی اصلاح نہ ہو اور ان میں انفاق' ایثار اور احسان کا تقاضا پیدا نہ ہو تو شخصیت کے اس پہلو کی نشوونما نہ ہو سکے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ افراد اسلامی معاشرے کے رُکن ہونے کی اہلیت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے معاشرے کے افراد میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (مومن یقیناً بھائی بھائی ہیں) کے حوالے سے اخوت پیدا ہوتی ہے جس کا معیار یہ ہے کہ جب تک ایک مومن اپنے مومن بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ﴿حدیث﴾

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

عمرانی حیاتی پہلو

عمرانی حیاتی پہلو کے دو تقاضے ہیں:

ازدواج اور بقائے نسل

ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے نکاح کے ذریعے خاندان کے ادارے کا قیام

ضروری ہے۔ خاندان کا ادارہ نکاح کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ نکاح ایک معاہدۂ عمرانی کی حیثیت رکھتا ہے جو زوجین کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس پہلو کے تقاضوں کی تکمیل میں معاشرے کی بے حسی اور مرد وزن کا افلاس حائل ہوتا ہے۔ جسے رفع کرنے کے لئے افراد اور معاشرے اور ریاست تینوں کا تعاون ضروری ہوگا اور اس ذمہ داری کو ادا کرنا ہی معاشرے کے مہذب ہونے کا ثبوت ہے۔

عمرانی ثقافتی پہلو

انسانی شخصیت کے عمرانی ثقافتی پہلو کی نشوونما اس کے دو تقاضوں کی تکمیل پر منحصر ہے۔ ایک تعلیم اور دوسرا معاشی تخلیق کی تربیت۔ تعلیم کے لئے ایسا نظام ضروری ہے جو انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے نصب العین اور ان کو حاصل کرنے کے لائحہ عمل کی تلقین کی ذمہ داری ادا کرسکے۔ معاشی تخلیق کی تربیت مطلب معاشی نظام کے حوالے سے ممکن ہوگی جس میں ہر دور کے معیارِ زندگی کے پیش نظر کسی تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو عادلانہ معیشت کے قیام کی خاطر رفع کرنا لازم ہوگا یہ تربیت گلہ بانی، تجارتی سرمایہ داری، زراعت، جاگیرداری، مستعمراتی نظام، مشینی صنعتی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے معاشی تصورات کو قرآنی مقاصد کے معیار کے حوالے سے دی جاسکے گی۔ افراد کا بخل، معاشرے کی بے حسی، ریاست کی اپنی ذمہ داری سے غفلت اس پہلو کی نشوونما میں رکاوٹ ہوگی۔ یہ ذمہ داری تعلیمی اور معاشی تخلیق کے تربیتی ادارے ادا کرسکیں گے جو طلباء اساتذہ، منتظمین اور والدین پر مشتمل ہوں گے۔

نفسیاتی پہلو

انسانی شعور میں جذبہ' ارادہ اور ادراک اگرچہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں مگر متمیز ضرور ہیں۔ نفسیاتی پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ جذبہ' ارادہ اور ادراک متناسب انداز سے ہم آہنگی کے ساتھ نشوونما پائیں۔ اس کے شرائط اعلیٰ سطح کی تعلیمی ریسرچ سے متعین ہوں گے جس کی جانب ابتداء ہی میں رُخ متعین کرنا ضروری ہوگا۔ مقصود یہ ہے کہ متوازن شخصیت نشوونما پائے۔ یہ توازن دین کے بنیادی تصورات کے درمیان باہمی ربط کے ساتھ مشروط ہوگا۔ اس مقصد کے لئے نفسیات کے علم کو علم بالوحی کی روشنی میں مدون کرنا ضروری ہوگا۔

انفسی پہلو

انسانی شخصیت کا ایک پہلو انفسی (Subjective) بھی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ شعور اور لاشعور میں ہم آہنگی رہے۔ شعور عبارت ہے بالفعل فطرت کے تقاضوں سے اور لاشعور عبارت ہے بالقوہ فطرت سے۔ شعور و لاشعور کی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہے کہ بالفعل فطرت کے تقاضے یعنی جبلی داعیات' طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضے بالقوہ فطرت کو نشوونما دے کر اس کے تحت ضبط و انقیاد کے تابع رہیں۔

ماورائی پہلو

مذکورہ پہلو انسانی شخصیت کے محسوس پہلوؤں کے تحت آتے ہیں۔ شخصیت کا ماورائی پہلو:

ہر دوسری شے کے غیر ہونے کے شعور اختیار یعنی کسی
فعل کو کرنے نہ کرنے کے اختیار اور فعل کی قابلیت یعنی

بلا استحقاق عطا کر سکنے کی صفت پر مشتمل ہے جس کی نشوونما شعور علمی، شعورِ اخلاقی اور شعورِ مذہبی میں مضمر غایات عالیہ کے حوالے سے ہوتی ہے۔ ہر دوسری شے سے غیر ہونے کے شعور کے اعتبار سے "علم" میں اس کی حیثیت "ناظر" (Subject) کی ہے جو اس حد تک ماوراء ہے کہ وہ منظور (Object) نہیں بن سکتا۔

اخلاق میں اس کی حیثیت قضیہ اخلاق کے صادر کرنے والے "حکم" کی ہے جس کی بنیاد پر انسان کو اپنے اعمال کی بصیرت حاصل ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝

﴿القیامہ: ۱۴۔۱۵﴾

"انسان آپ اپنا گواہ ہے۔ اگرچہ عذر و معذرت کرتا رہے۔"

مذہب میں شخصیت کے ماورائی پہلو کی حیثیت "عبودیت" کا شعور رکھنے والے کی ہے۔ ماورائی پہلو کی نشوونما علم، اخلاق اور مذہب میں مضمر غایات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے سے ہوگی۔

انسانی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کی نشوونما کے لئے مختلف عمرانی اداروں کے وجود میں آنے سے ہوگی یعنی حیات عمرانی کی نشوونما کی دوسری شرط کے پورا ہونے سے دوسری شرط ہیئت عمرانی اور اس کی تکمیل ہے۔

ہیئت عمرانی

ہیئت عمرانی سے مراد مختلف عمرانی اداروں کا وجود میں آنا ہے جیسے:

- ⇦ خاندان
- ⇦ مسجد
- ⇦ مدرسہ
- ⇦ معاشی تخلیق کی تربیت کے ادارے
- ⇦ یتیم خانے
- ⇦ شفاخانے
- ⇦ ریاست
- ⇦ بیت المال

خاندان کا ادارہ

خاندان نکاح سے وجود میں آتا ہے۔ نکاح زوجین کے درمیان ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر انسانی شخصیت کے عمرانی حیاتی پہلو کے ازدواج اور بقائے نسل کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

نکاح کا خطبہ جو اس معاہدے کی بنیاد ہے عائلی زندگی کے صحت مندی سے بسر ہونے کی ضمانت دیتا ہے' یوں ہے:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ نَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ----

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ○ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ
رَقِيْبًا○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا○ يُّصْلِحْ
لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا○

ترجمہ: سب تعریف اللہ کے لئے ہے ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے مغفرت مانگتے ہیں اور ہم اپنے نفس کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ ہدایت دکھانے والا نہیں ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں بجز خدا کے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبردار ہو۔ اے انسانو! ڈرو اپنے پروردگار سے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی ایک سے اس کا جوڑ بھی پیدا کیا اور ان ہی دونوں سے نکال کھڑا کیا بہت سے مردوں اور عورتوں کو۔ اور

ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے ایک دوسرے سے سوال
کرتے ہو اور ڈرو حقوق قرابت کے باب میں۔ بے شک اللہ
تعالٰی تمہارے اوپر ہر وقت نگران ہے۔ اے ایمان والو! ڈرو
اللہ سے اور جو بات کرو سیدھی جچی تلی کرو۔ اللہ تمہارے لئے
تمہارے اعمال درست کر دے گا اور اللہ تمہارے معصیتیں بخش
دے گا۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت
کی تو بیشک بڑی مراد پائے گا۔"

یعنی اگر زوجین اللہ سے ڈریں جیسا کہ اس کا حق ہے اور تازیست فرمانبردار رہیں اور قرابت کے باب میں اللہ سے ڈرتے رہیں تو بے شک اللہ تمہارا ہر وقت نگہبان ہے اور جو بات کرو سیدھی اور جچی تلی کرو تو اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادے گا اور تمہاری سب خطائیں معاف فرمادے گا۔

خاندان کے ادارے میں اختلال کا سب سے بڑا سبب جنسی بے راہروی ہے جس کی سزا بہت شدید ہے۔ اگر زوجین اللہ سے ڈریں گے تو ہر خرابی سے محفوظ رہیں گے۔

خاندان کا ادارہ نئی نسل کے لئے سب سے زیادہ خوشگوار ماحول فراہم کرتا ہے۔ کوئی مربی باپ کا بدل ہو سکتا ہے نہ کوئی انا یا نرس ماں کی برابری کر سکتی ہے۔ والدین کے تعلق سے بچوں میں نازک ترین جذبات اور احساسات کی نشوونما ہوتی ہے۔ جو بچے والدین سے محروم ہو جاتے ہیں ان میں شقاوت و قساوت کی نفسیات نشوونما پاتی ہے اسی لئے اس سے بچانے کے لئے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ یتیموں کے ساتھ محبت و شفقت کا ایسا برتاؤ کیا جائے کہ ان میں اپنی محرومی کا احساس پیدا نہ

ہو۔

مسجد

مسجد ایک کثیر المقاصد ادارہ تھا جس کی حیثیت عبادت گاہ کی بھی تھی۔ مہمان خانے کی بھی تھی۔ مسجد ہی ایوان حکومت کی حیثیت بھی رکھتی تھی جو اب اپنی افادیت میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ امام' خطیب' مؤذن اور نمازی اس کے ارکان تھے اور ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کے معاملات سے دلسوزی نابود ہو گئی ہے جسے ازسرنو تازہ کرنا ضروری ہے۔

مکتب' مدرسہ' کالج اور یونیورسٹی' یہ سب عمرانی اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ تعلیم ایک عمرانی عمل ہے۔ تعلیم حیات ملی کو دوام استمرار عطا کرنے کا عمل ہے جس کے مضمرات میں تعلیم' متعلم اور نصابِ تعلیم داخل ہیں۔ جب تک اعلیٰ ترین معیار کا نظام اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے شرائط پورے نہ ہوں زندگی کو زوال سے نکالنا ممکن نہیں۔ تعلیمی اداروں کی تنظیم غلبہ دین حق کی خاطر مثالی معاشرے کے قیام اور بقا اور ترقی کی غرض سے وجود میں آنی چاہیے۔ تمام تمدنی علوم جو یونیورسٹی کی سطح پر داخل نصاب ہیں' ان کی نشوونما "اقدام و خطا" (Trial And Error) کے انداز میں ہوتی رہی ہے۔ اور ان کی حیثیت علم ماہیت کی ہے اس لئے اسلامی تحقیق کے ذریعہ تمام تمدنی علوم کا نمونہ جب تک علم بالوحی یعنی علم الغایات کے نقطہ نگاہ سے موضوعات' مسائل منہاجات' مسلمات وظائف اور زندگی پر اثرات کے حوالے سے تبدیل نہ کیا جائے تب تک نظام تعلیم کا وظیفہ اسلام کے نقطہ نگاہ سے بدآموزی (Miseducation0) اور تخریب ہی رہے گا۔

معاشی تخلیق کی تربیت کے ادارے

جب تک معاشی تخلیق کی تربیت کے ادارے قائم نہ ہوں افراد خود کفیل نہ بن سکیں گے اور یہ تب ہی ممکن ہو گا جب تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرنے کا نظام پیدا کیا جائے۔ جب سے معاشی تخلیق کے نظام زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں یہ مشکل حکومت کی امداد کے بغیر رفع نہیں ہو سکتی۔

شفاخانے

کسی قوم اور معاشرے کے مہذب ہونے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ اُسے لوگوں کی صحت' بیماریوں کے علاج سے کتنی دلچسپی ہے اور ان کے لئے کیا کیا آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں معالج اور دوائیں اور مریضوں کی تیمارداری کا کیا نظام ہے اور کتنی فراخدلی سے مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے۔

یتیم خانے

یتیم خانے تو اسلامی سیرت میں زوال کے نتیجے میں علیحدہ اداروں کی حیثیت سے اس وقت وجود میں آئے ہیں جب مختلف خاندان اپنے ارکان خاندان کی حیثیت سے یتیموں کی سرپرستی سے دستبردار ہو گئے۔

ریاست

اسلامی ریاست' اسلامی معاشرے کے سیاسی طور پر منظم ہونے سے وجود میں آتی ہے جس کے نتیجے میں مطاع (Super Ordinate) اور مطیع (Subordinate) وجود میں آتے ہیں۔ جب یہ وجود میں آجائیں تو مطاع کو قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مطیعوں سے جبراً اطاعت طلب کر سکے۔ اگر اطاعت

طلب کرنے کا محرک ہوس اقتدار کی تسکین ہو تو ایک ظالمانہ نظام وجود میں آتا ہے جس میں مطالبہ حقوق محرک عمل بن جاتا ہے۔ مطالبہ حقوق، محرک عمل ہو تو حقوق کے درمیان تصادم کبھی رفع نہیں ہوسکتا۔ جس سے حقوق طلب کئے جاتے ہیں وہ ظالم اور غاصب متصور ہوتا ہے اور جو حقوق طلب کرتا ہے وہ بے تقاضائی کا ارتکاب کرنے والا قرار پاتا ہے۔ اس تصادم کو اسلام یوں ختم کرتا ہے کہ مطالبہ حقوق کے بجائے "ایتائے حقوق" کو محرک عمل بناتا ہے یعنی فرائض کی انجام دہی کو اگر فرائض کی انجام دہی کو محرک عمل ہو تو تمام حقوق، مطالبہ حقوق سے پہلے ہی ادا ہوچکے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی ریاست میں حقوق کے درمیان تصادم پیدا ہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔

دراصل اجتماعی زندگی کے سیاسی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت ہوس اقتدار ہے اور اس کی اصلاح پذیری کا تصور یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر معاہدہ عمرانی وجود میں لایا جائے۔ جس کے لئے اس آیت پاک میں حکم ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۝ ﴿النساء:۵۹﴾

"اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس کی جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔"

کیونکہ مطاع نامشہود معاہدۂ عمرانی کا فریق نہیں بن سکتا۔ اس لئے باذن اللہ رسول اللہ ﷺ ہی مطاع مطلق ہیں جیسا کہ اللہ پاک فرماتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴿النساء:۶۴﴾

"اور ہم نے جو پیغمبر ﷺ بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔"

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج ﴿النساء:۸۰﴾

"جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔"

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پوری کائنات پر اقتدار کے پیش نظر مابعد الطبیعی سطح کے اقتدار کو سیاسی اقتدار کی حیثیت دینا چاہتے ہیں وہ دو گروہ ہیں:

ایک دورِ جدید کی جمہوریت کے پرستار جو اپنی تعبیر کی رُو سے اقتدار عوام کو منتقل کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ مذہبی طبقات جو فرقہ پرستی کے تحت توحید اور رسالت کے تقاضوں میں التباس پیدا کر کے یہ امتیاز ملحوظ رکھنا پسند نہیں کرتے کہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ "عبادت" خالصتہ اللہ تعالیٰ کی' کی جائے اور رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ اطاعت خالصتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی' کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کوئی راستہ بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے نہیں ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی باذن اللہ مطاع مطلق ہیں۔

بیت المال

فلاح عامہ کے لئے بیت المال بھی ایک ادارہ ہے جو حکومت کے کنٹرول میں ہونا چاہیے کیونکہ افراد کی معاشی تخلیقی جدوجہد میں تعطل رفع نہ ہو تو پوری قوم افلاس میں مبتلا ہوگی اور حکومت کی مالیات میں اضافہ کرنے کی اہلیت سے وہ سب لوگ محروم ہو جائیں گے جو تخلیق دولت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے بیت المال کا ایک اہم وظیفہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے افراد کی معاشی تخلیقی جدوجہد کا تعطل بھی رفع ہوگا اور بیت المال کے ذریعے معذوروں کی کفالت بھی ہو سکے گی۔

ہیئتِ عمرانی کی تکمیل

ہیئت عمرانی کی تکمیل عبارت ہے مختلف ادارات کے ارکان کے عمل کو منضبط اور منقاد بنانے کے لئے اوامر و نواہی کے ایسے ضابطے سے جس کی پیروی سے دارے اور ارکان ادارات اپنا وظیفہ صحت مندی سے ادا کر سکیں۔

تسخیرِ ماحول

کسی معاشرے کی نشوونما کی اہم ترین شرط ماحول کو مسخر کرنا ہے دراصل ماحول کی دو حیثیتیں ہیں:

۱۔ فطری ماحول

۲۔ انسانی ماحول

فطری ماحول

فطری ماحول جغرافیائی احوال پر مشتمل ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی سے مسخر ہو سکتا ہے جیسے صنعتی کارخانے' جن کے بغیر نہ تو صنعتی تخلیق کی رفتار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ نہ سڑکیں اور پل اور عمارات بنائی جا سکتی ہیں نہ نقل و حمل میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

اِنسانی ماحول

انسانی ماحول دو قسم کا ہے:

۱۔ بے تعلق اور بے پروا

۲۔ معاند ماحول

بے پروا ماحول

بے تعلق اور بے پروا ماحول نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما دینے سے مسخر ہو کر رہتا ہے۔

معاند ماحول

معاند ماحول کو طاقت سے زیر کر کے نشوونما دی جائے تو مسخر ہو کر رہے گا معاند انسانی ماحول کسی قوم کی بقا اور ترقی کی وہ شرط پوری کرتا ہے جو چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ معاندانہ چیلنج ہی قوموں اور تہذیبوں کی بقا اور ترقی کی اہم ترین شرط ہے جس سے اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ
الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ
شَهِیْدًا۔ ﴿الفتح: ۲۸﴾

بین الاقوامی
نصب العین

بین الاقوامی زندگی

بین الاقوامی زندگی اپنی خاصیت میں عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہے۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط (یونس:۱۹)

"نوع انسانی پہلے ایک ہی امت تھی پھر انہوں نے اختلاف پیدا کرلیا۔"

یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی کہ فطرت انسانی میں بالقوہ پہلو اور بالفعل پہلو کی ثنویت کے باعث جو تضاد ہے اس کی بناء پر اس کے باوجود کہ انبیاء کی تعلیمات کے نتیجہ میں عمرانی وحدت کا شعور پیدا ہوا تھا وہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی حالت کی طرف لوٹ آئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضے اپنی تکمیل بغیر کسی قید کے چاہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مطالبہ حقوق محرک عمل بن گیا اور جب حیات اجتماعی میں مطالبہ حقوق محرک عمل بن جائے تو حقوق کا تصادم رفع نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو حقوق طلب کرتا ہے وہ بے نظامی کا مرتکب متصور ہوتا ہے اور جس سے حقوق طلب کئے جاتے ہیں وہ غاصب اور ظالم قرار پاتا ہے۔ اس لئے حقوق کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس تصادم کی خاطر محدود بنیادوں پر متخاصم تنظیمات وجود میں آتی ہیں۔ ریاستوں کی صورت ۔ں معاشروں

کی تنظیم ضروری ہو جاتی ہے اور ریاست سیاسی اعتبار سے منظم ایسا ادارہ متصور ہوتی ہے جسے اپنی بقا اور توسیع کے لئے "صلح" اور "جنگ" کا اختیار حاصل ہو۔ یوں بین الاقوامی زندگی عداوت' عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں انسانیت امن و عافیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس عداوت و عناد نے دو نظریے پیدا کئے ہیں:

۱۔ "انسانیت کی ترقی کے لئے جنگ ضروری ہے" کیونکہ ایک کوشش جنگ کرنے کی خاطر جنگ سے پہلے ہوتی ہے اور دوسری بعد از جنگ اس نقصان کی تلافی کے لئے ہوتی ہے جو جنگ سے ہوتا ہے۔

۲۔ "انسانیت کی ترقی کے لئے امن ضروری ہے۔" مگر تاریخ سے جو شہادت ملتی ہے وہ یہی ہے کہ امن' امن کی خاطر نہیں بلکہ ہر جنگ کے بعد جنگ کی تیاری کے لئے مہلت کے طور پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد "مجلس اقوام" کا ادارہ وجود میں آیا تھا مگر اس کے ارکان کی مفاد پرستی کی بدولت یہ تنظیم ناکام ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم (یو-این-او) وجود میں آئی۔ مگر یہ تنظیم بھی دو معاند اور متخاصم سپر طاقتوں کے مفادات کا آلہ کار بن کر رہ جانے کی وجہ سے بے اثر ہو گئی ہے کیونکہ دونوں سپر طاقتیں نہایت ہی مہلک اسلحہ سے مسلح ہونے کی بناء پر ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں مگر اپنی عسکری صنعت کو فروغ دینے کے لئے کمزور اقوام کو اپنی اپنی عسکری صنعت سے پیدا کیا ہوا اسلحہ فروخت کر کے جنگ میں مبتلا رکھتی ہیں۔

یہ صورت حال انسانیت کو خوف و غم میں مبتلا رکھتی

ہے۔

اس صورت حال کا علاج یہ ہے کہ:

"عالم اسلام متحد ہو"

اتحاد کا محرک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ عداوت ہے جو اتنی شدید ہو چکی ہے کہ اب اس میں شدید تر ہونے کی گنجائش نہیں رہی۔ اس کے باوجود کہ مسلمان کرۂ عرض کی آبادی کا کم و بیش ایک تہائی حصہ ہیں' زوال پذیر ہو کر سینتالیس بااقتدار ریاستوں کی صورت میں منقسم ہو گئے ہیں۔ جس کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس نصب العین نے انہیں متحد کیا تھا اس کا تصور خیرہ ہو گیا۔ تنظیم و اتحاد کا شعور مٹ گیا' فضائل اخلاق مسخ ہو گئے اور اختلال انگیز موثرات کے جواب میں قومی کردار کی حفاظت کی اہلیت سے محروم ہو گئے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ بین الاقوامی صورت حال میں ہمارا عدم اور وجود برابر ہو گیا ہے۔

اس صورت حال کا علاج اپنی حیثیت کا شعور پیدا کر کے ہو سکتا ہے!

مسلمان اسلام کی بناء پر ایک عالمی قوم ہیں۔ دین کی اساس پر ایک امت ہیں اور ایک نظام فکر و عمل کے حامل ہونے کی حیثیت سے ایک پارٹی ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے ہمارا محرک اسلام ہے۔ بحیثیت ایک امت کے ہماری دعوت غلبہ اسلام ہے یعنی منزل من اللہ قانون کا غلبہ اور بحیثیت ایک پارٹی کے ہماری وفاداری اپنے ہادی اعظم اور اللہ کے آخری رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر مرکوز ہے۔

یہ محرک' یہ دعوت اور یہ وفاداری محض معتقدات کلامیہ نہیں ہیں۔ بلکہ

تاریخی حقائق ہیں۔ ان حقائق نے ابتدا ہی سے اسلام کو سرسبز و شاداب رکھا ہے لیکن کسی فرد کی طرح ہیئت عمرانی بھی زوال' انحطاط اور موت سے ہمکنار ہوتی ہے اور جیسا کہ مذکور ہوا' اجتماعی موت عبارت ہے غائیت کے تصور کے خیرہ ہو جانے' تصورِ کائنات کے مسخ ہو جانے اور نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے سے۔

ہر چند کہ ہم عالمی سطح پر بہت سی آزاد خود مختار ریاستوں کے درجے پر فائز ہیں مگر ذہنی' سیاسی اور معاشی سطح پر ہم پٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہماری قوت فیصلہ مفلوج اور مبہوت ہو کر رہ گئی ہے اور ہم اپنی راہ التباس کے اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں اور پوری بصیرت نہ ہونے کی بنا پر ناگزیر انداز سے غیر اسلامی بلکہ مخالف اسلام فضائل کو (اگر انہیں فضائل کہا جا سکتا ہو) اپنے اندر جذب کرتے جا رہے ہیں۔

ہم اپنی دعوت کے شعور سے محروم ہو گئے ہیں اور اپنی عظیم الشان میراث کے بارے میں اپنے اندر ایک شرمساری محسوس کرتے ہیں اور اپنے زوال پذیر معاشرے کے احیاء کے لئے مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہم میں سے بعض تو اس حد تک تجاوز کر گئے ہیں کہ قانون اسلام کو فرسودہ اور دورِ جدید کی احتیاجات کے لئے ناموزوں قرار دینے میں بھی کسی قسم کی جھجک اور شرم و حیا محسوس نہیں کرتے اور بالواسطہ اپنے دشمنوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں' جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک ختم شدہ قوت ہے۔

ہم بالکل معصومانہ انداز سے یہ بھولے جا رہے ہیں کہ اسلام نے دنیا کو مادی اعتبار سے بھی کم از کم اتنی تاب ناک تہذیب ضرور سکھائی تھی جتنی مغربی تہذیب ہے اور انتہائی بدنصیبی سے ہم اس حقیقت کو نظرانداز کیے دے رہے ہیں کہ آج بھی اسلام اور صرف اسلام ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ایک صحت مند' عمرانی اعتبار سے ایک مستحکم اور معاشی اعتبار سے ایک عادلانہ تہذیب پیدا کر سکے

اور اسے برقرار رکھ سکے۔

بہرحال اس ذہن کا سبب اصلی ہماری اخلاقی اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس نے ہماری ہستی کے اخلاقی اور طبعی پہلوؤں کے درمیان ایک شگاف ڈال دیا ہے جو روزبروز وسیع تر اور شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ صورت حال اگر شرمناک نہیں تو افسوسناک ضرور ہے۔

یہ دلدوز واقعہ انسان کے عمرانی کردار کے ہر مطالعہ کرنے والے پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس واقعہ پر اس حقیقت کا اضافہ اور فرما لیجئے کہ صرف مادی تہذیب کے سہارے اور صرف مادی سازوسامان کے ذریعہ صرف مادی جدوجہد کی اساس پر دنیا کی کوئی قوم علی الخصوص مسلمان نہ ترقی کر سکتے ہیں نہ باقی رہ سکتے ہیں۔ مادی وجود کی تہ میں قومی ہستی کی اساس میں اخلاقی مثال پرستی اور روحانی جوش و حرارت کا ہونا ناگزیر شرط ہے تاکہ فرد اور معاشرے کو اخلاقی ولولہ عطا ہو سکے اور قوم اپنی ارتقائی جدوجہد میں اپنی اجتماعی زندگی کے سرچشموں سے سیراب ہوتی رہے اور اختلال انگیز موثرات کے جواب میں قومی کردار کی مدافعت کر سکے۔

ان دو حقیقتوں پر ایک تیسری حقیقت کا اضافہ اور کیجئے کہ عمرانی وجود کے خارجی مظاہر اور باطنی اساس میں ایک وحدت کا رشتہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاق اور باطن میں ہر تبدیلی بلا استثنا طبعی (مادی) پہلو کو متاثر کر کے رہتی ہے۔

پس ان تمام لوگوں کے لئے جنہیں اسلام اور مسلمانوں کی تقدیر سے پرخلوص وابستگی ہے، سب سے اہم مسلمانوں کا ذہنی اور اخلاقی مسئلہ ہے۔

اس کا انکار محالات میں سے ہے کہ عالم اسلام اس وقت ایک ہلاکت خیز طوفان میں گھرا ہوا ہے اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس آزار سے آنکھ بند کر لینا ممکن نہیں جو اندر ہی اندر امت مسلمہ کے وجود کو

کھائے جا رہا ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اس آزار کا مداوا تلاش کرنے سے پہلوتہی کرنے اور یہ جستجو چھوڑ دے کہ وہ اکسیر حیات کیا ہے جو اس آزار کا علاج ہو سکے اور ہماری عظمت رفتہ کو واپس لا کر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم بنا دے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ قرآن کریم کی عطا کردہ وہ کونسی تدبیر ہے جس میں اس بات کی ضمانت ہو کہ بین الاقوامی سطح پر ہم پھر غالب ہو سکیں۔

تاریخ اسلام کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے ظاہر ہو گا کہ یہ مداوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ مبارک کی پیروی میں مضمر ہے جن ﷺ کی حیات طیبہ اپنے اندر انسانیت کے اخلاقی عمل' انفرادی اور اجتماعی مظاہر کا انتہائی پاکیزگی کے ساتھ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جو ایک زندہ حقیقت ہے اور عملی اسلام کا ایک جگمگاتا ہوا نمونہ ہے۔ اور ہمیشہ مسلمانوں کی ترقی کا سرچشمہ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کے اسوۂ کامل کی پیروی کے سوا کسی طرح اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے' جس کے واسطے سے دین اسلام نازل ہوا۔ قرآن مجید اس حقیقت پر واضح ترین الفاظ میں یوں اصرار کرتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا○

﴿النساء:٦٥﴾

"پروردگار کی قسم۔ یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں اپنا منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم ﷺ کرو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔"

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿الاحزاب:۲۱﴾

"تم کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی بہتر ہے یعنی اس شخص کو جسے خدا سے ملنے اور روزِ قیامت کے آنے کی امید ہو اور خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔"

یہی وہ حقیقی اسلام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نمایاں ہے۔ جس میں اختلافات امت اور تعبیرات کا اختلاف سب سے کم رہ جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہی وہ سچا اسلام ہے جس سے ہم اپنے احیاء کی ابتدا کر سکتے ہیں اور تمام منافی اسلام اثرات سے بچنے کی صرف یہی حتمی' قطعی اور یقینی پناہ گاہ ہے۔

اس وقت دنیا میں جو حالات ہیں اور مسلمانوں کی زندگی اور ان کی اخلاقی حالت کی وجہ سے وہ جس عظیم ترین خطرے سے دوچار ہیں اس کے باوجود حالات مایوس کن نہیں ہیں۔ مایوسی کے سیاہ بادل جو عالم اسلام پر چھائے ہوئے ہیں' وہ چھٹنے کو ہیں اور امید کی کرن افق میں نمودار ہو رہی ہے۔ عالم اسلام کی موجودہ سیاسی بیداری اور اپنی تقدیر کے امکانات کا شعور جو آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے اور کھویا ہوا اعتماد جو بہ تدریج پھر سے حاصل ہو رہا ہے۔ پاکستان کے نصب العین کے بارے میں جو یقین از سر نو تازہ ہو رہا ہے اور مسلم ممالک سے جو مفاہمت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ سب انتہائی خوشگوار' عزم پرور' اعتماد انگیز علامات ہیں۔

اس وقت سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہماری قومی' ہستی کے مسئلے کو سطحی اور سرسری انداز سے حل کرنے کے بجائے علمی انداز سے حل کیا جائے۔ عملی

طریق کار مسئلے کو ہمہ گیر انداز سے سمجھنے اور اس کے داخلی و خارجی پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں مضمر ہے۔ جو لوگ یہ ہمہ گیر نقطہ نظر اختیار کرسکتے ہیں وہ اس بات پر متفق ہوں گے کہ ایک عالمی تحریک جس پر مسلمانوں کی حیات قومی کی پائیدار تعمیر کی بنیاد رکھی جاسکے۔ جو اسلام کے عظیم الشان تاریخی کردار اور اس کے عمرانی قوام کے ساتھ ہم آہنگ ہو مسلمانوں کے اخلاقی اور روحانی استحکام کی تحریک ہے۔ ایسا احیاء ہی ہماری خود ارادیت کے نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اور یہ احیاء غلبہ دین کے نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے نتیجے میں میسر آئے گا۔

هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ○ ﴿توبہ: ۳۳﴾

"وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے اور سب دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔"

اس آیت پاک کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بیان نہیں چیلنج ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس نصب العین کے حصول کا ضامن قرآنی لائحہ عمل کیا ہے؟

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ
مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ ﴿الصف: ٨﴾

بین الاقوامی نصب العین

کا

لائحہ عمل

بین الاقوامی نصب العین کا لائحہ عمل صحیفہ انقلاب ہی سے میسر آسکتا ہے۔

صحیفہ انقلاب کی دو حیثیتیں ہیں:

۱۔ دورِ نبوت کا صحیفہ انقلاب

۲۔ دورِ مابعد نبوت کا صحیفہ انقلاب

۱۔ دورِ نبوت کے صحیفہ انقلاب (قرآن مجید) کی روشنی میں مقصودِ بعثت کو پانے کی جدوجہد کا دور ہے جو تین مراحل پر مشتمل ہے:

(الف) بعثت سے ہجرت تک:

یہ انفرادی زندگی کے فکری' ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح انسان مرتضیٰ بننے کے نصب العین کے حوالے سے کرنے کی جدوجہد کا دور ہے۔ فکری پہلو کی اصلاح زندگی اور کائنات کے باب میں بے مقصدی کے طرزِ فکر کو مقصدیت میں بدلنے اور ایمانی پہلو کی اصلاح حصولِ مقصد کے باب میں کامیابی کی نسبت تذبذب کو یقین راسخ میں بدلنے اور اخلاقی پہلو کی اصلاح خواہشات کی بے انضباطی کو ضبط و انقیاد میں بدلنے سے ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں فرد اسلامی معاشرت کا رُکن بننے کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔

(ب) ہجرت سے فتح مکہ تک:

اجتماعی زندگی کی اصلاح مثالی معاشرے کے قیام کے نصب العین کے حوالے سے معاشرتی پہلو کی خودپسندی اور نسلی تفاخر کو اخوت میں اور معاشی پہلو کے حرص و لالچ اور بخل کو انفاق' ایثار اور احسان میں اور سیاسی پہلو کی ہوسِ اقتدار کو کلمۂ طیبہ

پر مبنی اپنے معاہدہ عمرانی کے ذریعہ مطاع اور مطیعوں دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام کے یکساں واجب التعمیل ہونے کے عہد میں بدلنے سے میسر آتی ہے۔

ت : تیسرا مرحلہ فتح مکہ سے حجتہ الوداع تک غلبہ دین حق کی جدوجہد کا دور ہے۔ جس جس تدریج سے صحیفہ انقلاب نازل ہوتا رہا اس کی رہنمائی سے پیغمبرانہ قیادت کے تحت جدوجہد سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہوتے رہے۔

مگر فطرت انسانی میں بالفعل فطرت اور بالقوہ فطرت کی ثنویت اور اس کے درمیان تضاد بھی ہے جو بیک وقت انسان کا کمال بھی ہے اور نقص بھی۔ کمال اس معنی میں کہ جب بالقوہ فطرت کو نشوونما دے کر اور ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت کے تقاضے و انقیاد کے تابع ہو جائیں اور نقص اس صورت میں جب نگہداری میں غفلت کی بنا پر بالفعل فطرت کے تقاضوں کے غالب آجانے سے امت زوال و اختلال کا شکار ہو۔ جب قیادت اختلال انگیز موثرات کے جواب میں قومی کردار کی حفاظت کی اہلیت سے محروم ہو جائے تو دورِ مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب (قرآن بصورت ترتیب تلاوت) کی نتیجہ خیزی کا یقین تجربی توثیق و شہادت سے بحال کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔

۲۔ دورِ مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب کی نوبت آہی جب جاتی ہے جب امت مسلمہ ایک دفعہ قرآنی ہدایت کے زیر اثر بین الاقوامی عروج پر فائز ہونے کے بعد زوال پذیر ہو جائے۔ اور موثرات حیات بالکل بدل جائیں اور بین الاقوامی سطح پر جدید جاہلیت غالب آگئی ہو تو یہ جستجو لازم آئے گی کہ بین الاقوامی زندگی میں فساد کے سرچشمے کو متعین کیا جائے۔ جس کے اثر سے پہلے قومیں اور معاشرے تباہ ہوئے ہیں۔ پھر افراد کی خیروفلاح سے ناسازگار احوال پیدا ہوتے ہیں۔

اب قرآن مجید نازل ہو چکا ہے اور امت مسلمہ ایک دفعہ بین الاقوامی سطح پر

غلبہ حاصل کر چکی ہے لہٰذا موجودہ حالات کے پیش نظر بین الاقوامی نصب العین کے حوالے سے امت مسلمہ زندگی کے اجتماعی پہلوؤں کی اصلاح کے لئے دور مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب یعنی قرآن مجید کی ترتیب تلاوت سے ہدایت طلب کرے۔

بین الاقوامی سطح پر زندگی عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کی مظہر ہے اور اس جنگ در جنگ کے مظہر ہونے کا سرچشمہ' بین الاقوامی زندگی میں ریاست کا یہ تصور ہے کہ:

> ریاست سیاسی طور پر منظم ایسے معاشرے کا نام ہے جسے اپنی بقا اور توسیع کے لئے دوسری ریاستوں سے صلح اور جنگ کا اختیار حاصل ہو۔

لہٰذا زندگی کے جنگ در جنگ ہونے کا مائع خمیر ریاست کے اس تصور سے پیدا ہوتا ہے۔

اس صورت حال کا علاج تب ہی ہو سکتا ہے جب مثالی ہیئت اجتماعیہ نے معاشرتی' معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما دینے کی حفاظت کے لئے مثالی ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئے جو اپنی سیاسی تنظیم کی حفاظت کے لئے مسلح طاقت کے استعمال کو ضروری سمجھے جو کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے اس موقف کی حفاظت کر سکے کہ مطاع اور مطیعوں دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام یکساں واجب التعمیل ہیں اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کی سزا اقتدار سے محروم کر دیا جانا ہے (سورۂ توبہ: آیت ۲۴) اور چونکہ مثالی ہیئت اجتماعیہ نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما دینے کے لئے وجود میں آتی ہے لہٰذا انفاق فی سبیل اللہ میں بخل کرنے کی سزا بھی اقتدار سے محروم کر دیا جانا ہے۔ (سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ۳۸)

دور مابعد نبوت کا صحیفہ انقلاب قرآن مجید بصورت ترتیب تلاوت اسی لئے ہے کہ ترتیب تلاوت بین الاقوامی سطح کے طریق انقلاب سے شروع ہوئی جو انتخابی جدوجہد سے پیدا ہونے والے ردِعمل کی اقسام (ایمان' کفر اور منافقت) کے تجزیہ سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتداء اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا سے ہوتی ہے۔ اس دعا کا محتوی (Content) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصود کو پانے کی صراط مستقیم ہے جس کے جواب میں وہ ہدایت تفویض کی جا رہی ہے جو بین الاقوامی سطح کے انقلاب کے لائحہ عمل پر مشتمل ہے۔

بین الاقوامی سطح کے نصب العین کے حصول کا ضامن لائحہ عمل مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے:

۱۔ وہ کونسا تضاد ہے جس کے شدید تر کرنے سے وفاداری متعین ہوگی' جماعت منضبط ہوگی اور تصادم فیصلہ کن ہوگا۔

۲۔ اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ انقلاب کی یہ جدوجہد تخریب محض میں ختم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کے تعمیری نتائج پیدا ہو کر رہیں؟

۳۔ جب تک انقلابی جماعت میں تصادم کی طاقت پیدا نہ ہو انقلابی جماعت کا پروگرام کیا ہو کہ ولولہ سرد نہ ہو' مقصد کے قریب تر ہوتے جائیں اور قبل ازوقت تصادم کو اس وقت تک التواء میں رکھ سکیں جب تک تصادم کی طاقت پیدا ہو سکے؟

۴۔ اس کی سب خطا پیش بینی کی جا سکے کہ دعوت انقلاب کے کتنی اقسام کے ردِعمل پیدا ہوں گے؟

۵۔ وہ محرک کیا ہوگا جو انقلابی جدوجہد میں استقامت پیدا کرے اور انحراف نہ

کرنے دے؟

۔ ہر ردِ عمل کے جواب میں انقلابی قیادت کیا طرزِ عمل اختیار کرے کہ اُسے صورتِ حال پر تصرف کامل حاصل ہو جائے؟

ا۔ وہ تضاد جس کے شدید تر کرنے سے وفاداری متعین ہوگی جماعت منضبط ہوگی اور تصادم فیصلہ کن ہوگا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور تکذیب کا تضاد ہے جس سے مومن' منافق اور کافر وجود میں آتے ہیں۔ یہ تضاد کائناتی قانون نشوونما کے تحت وجود میں آتا ہے جس کی تشکیل قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے:

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ﴿الفرقان:۳۱﴾

"ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا۔"

یہ دشمن پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کرتا ہے اور مزاحمت کی مزاحمت سے دعوت کامیاب ہوتی ہے۔ اس سے دو جماعتیں حزب اللہ اور حزب الشیطان وجود میں آتی ہیں حزب اللہ کی کامیابی فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ○ کے حوالے سے ضروری ہے جو کائناتی قانون سعادت و شقاوت کی بنیاد پر غلبہ حزب اللہ اور شکست حزب الشیطان پر منتج ہوتی ہے جس کی تشکیل قرآن اِن الفاظ میں کرتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا○ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا○ ﴿الشمس:۹'۱۰﴾

"وہ یقیناً فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ سے پاک کیا (کیونکہ وہ دوسروں کو نشوونما دے گا) اور وہ یقیناً تباہ ہو گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ میں مبتلا رکھا (کیونکہ وہ مزعومہ مفاد کی خاطر نفع بخشی' فیض رسانی اور نشوونما کو روکے گا۔)

۲۔ چونکہ ازروئے قرآن نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما دینا ہی حق ہے اور مزعومہ مفاد کی خاطر نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما کو روکنا ہی باطل ہے اس لئے پیغمبرانہ انقلاب جو حق وباطل کے درمیان تصادم پر مبنی ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

﴿بنی اسرائیل:۸۱﴾

کی بنیاد پر اس کی ضمانت ہے کہ پیغمبرانہ مقاصد کے لئے انقلاب کی جدوجہد تخریب [illegible] پر منتج نہ ہو بلکہ اس سے تعمیری نتائج برآمد ہو کر رہیں کیونکہ اسلام کی نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما دینے میں مثبت نتائج پیدا ہو کر رہنے کی ضمانت ہے۔

۳۔ جب تک تصادم کی طاقت نہ ہو اس وقت تک انقلابی جماعت کا پروگرام یہ ہونا چاہیے کہ انقلابی جماعت کے ارکان کو معاشی اعتبار سے مستحکم کیا جائے تا کہ ان میں تصادم کی طاقت پیدا ہو سکے۔ اس کا نمونہ کمال وہ "مواخات" ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم فرمائی تھی۔

۴۔ دعوت انقلاب سے تین رد عمل پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ ایمان

۲۔ منافقت اور

۳۔ کفر

اس سے تین گروہ وجود میں آتے ہیں:

⇦ مومن

⇦ کافر اور

⇦ منافق

ان میں سے ہر گروہ کی ایک مخصوص نفسیات ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔

مومن

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ ﴿البقرہ:۳﴾

جو غیب کا یقین رکھتے ہیں، نماز قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط ﴿البقرہ:۲۸۵﴾

مان لیا رسول نے جو کچھ اترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مومنوں نے بھی۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴿النسا:۱۶۲﴾

اور ایمان والے مانتے ہیں اس کو جو نازل ہوا آپ ﷺ پر اور جو نازل ہوا آپ ﷺ سے پہلے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ○ ﴿انفال:۲﴾

کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا
اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے' ان کے دلوں میں اللہ نے لکھ دیا
ہے ایمان اور ان کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے اور
داخل کرے گا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں۔
ہمیشہ رہیں گے ان میں' اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے
راضی وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا سنتا ہے اللہ ہی کی جماعت
کامیاب ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط قف وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴿الحشر:۹﴾

اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان
سے پہلے سے وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے
ہیں ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دل میں تنگی اس چیز سے
جو مہاجرین کو دی جائے اور مقدم رکھتے ہیں اُن کو اپنی جان
سے اگرچہ ہو اپنے اوپر فاقہ اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے
تو وہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا

وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ ﴿الحجرٰت:۱۵﴾

ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے، وہ لوگ جو ہیں، وہی ہیں سچے۔

کافر

قرآن کی رو سے مکذبین رسالت کافر ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔ ﴿البقرۃ:۸۹﴾

"پس جب وہ نبی آخرالزمان ﷺ اُن کے پاس آگیا جس کو وہ خوب پہچانتے تھے تو اس کا انکار کر بیٹھے۔"

کافر، محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کے نتیجے میں قرآن کی بھی تکذیب کرتے ہیں:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ق ﴿البقرۃ:۹۱﴾

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے (قرآن پر) تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے انکار کرتے ہیں۔"

یہ ۔ لمبی عمر کے حریص ہیں:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ﴿البقرہ:٩٦﴾

"اور آپ انہیں زندگی پر سب لوگوں سے بڑھ کر حریص پائیں گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار برس عمر ملے۔"

مسلمانوں پر خیر و برکت کا نزول کافروں کو پسند نہیں:

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ ﴿البقرہ:١٠٥﴾

"جو لوگ کافر ہیں خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے انہیں ذرا بھی پسند نہیں کہ تمہارے اوپر کوئی اچھی بات تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہو۔"

کافر تمہیں مرتد بنانا چاہتے ہیں:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ ﴿البقرہ:١٠٩﴾

"بہت سے اہل کتاب تو دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر سے کافر بنا ڈالیں۔"

یہود و نصاریٰ تم سے اپنے دین کی پیروی کرانا چاہتے ہیں:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ

مِلَّتَهُمْ ﴿البقرہ:۱۲۰﴾

"اور تم سے یہود اور نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک
کہ تم اُن کے دین کی پیروی نہیں کرو گے۔"

کافر اپنے جاہل باپ دادا کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ
نَا ط اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿البقرہ:۱۷۰﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے
(قرآن) اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس کی
پیروی کریں گے جس پر ہم نے باپ دادوں کو پایا ہے چاہے ان
کے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت۔"

کافر ہمیشہ مسلمانوں کو ان کے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے رہیں
گے:

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط
﴿البقرہ:۲۱۷﴾

"اور کافر لوگ تو تم سے جنگ جاری ہی رکھیں گے تاآنکہ ان کا
بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر کر ہی رہیں۔"

کافر میدان جنگ میں تمہیں غافل پا کر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑنا
چاہتے ہیں۔"

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ

عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ﴿النساء:۱۰۲﴾

"کافروں کی تو خواہش یہی ہے کہ میدان جنگ میں تم اپنے
ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تو یہ کافر تمہارے اُوپر
یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔" ۹۱

اہل کتاب کافر صحیح ایمان لانے کا تم سے انتقام لینا چاہتے ہیں:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ○ ﴿المائدہ:۵۹﴾

کہہ دیجئے اے کتاب والو۔ کیا ضد ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ
ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل ہوا ہم پر اور جو نازل ہو چکا ہم
سے پہلے اور یہی کہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

منافق

منافق کو مشخص کر کے مومنوں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کفر و اسلام کی کشمکش قتال فی سبیل اللہ کے مرحلے تک پہنچ جائے۔ اس مرحلے کے پیش آنے سے پہلے منافق کی پہچان کے لئے بین علامات کی ضرورت ہے۔

منافقین کے اوصاف یہ ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ ﴿البقرہ:۸،۹﴾

"اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور سمجھتے نہیں۔"

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْآ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴿البقرة:۱۱، ۱۲﴾

"اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! بے شک وہی لوگ مفسد ہیں، لیکن نہیں سمجھتے۔"

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ﴿منافقون:۱﴾

"جب آئیں آپ کے پاس منافق اور کہیں ہم قائل ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ اس کے رسول ﷺ ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔"

منافقوں کا کردار

منافقوں کے ظاہر و باطن کا مختلف ہونا۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ ﴿فتح:۱۱﴾

"یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں۔"

خودغرض اور موقع پرست ہونا

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ج فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ صلے وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ط فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ○

﴿النساء:۱۴۱﴾

اسلام اور حامیانِ اسلام کی مصیبتوں پر مسرور ہونا اور ان کی ترقی کو دیکھ کر جل جانا

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ز وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ط

﴿آل عمران:۱۲۰﴾

خطرے کے وقت اصول کی پابندی کو حماقت اور راست بازی اور دیانتداری کو بے وقوفی اور راہ حق میں اظہارِ عزیمت کو ناعاقبت اندیشی سمجھنا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ط ﴿بقرہ:۱۳﴾

اسلام کی مصلحتوں کے خلاف سازشیں کرنا

فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ

﴿النساء:۸۱﴾

اسلامی سیاسیات کے متعلق اہم امور کو جنہیں اہل حل و عقد کے پاس صیغہ راز میں رہنا چاہیے' عوام میں مشہور کر دینا

ارشادات نبوی ﷺ اور فرامین الٰہی کے خلاف سرگوشیاں کرنا

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ ﴿النساء:۸۳﴾

"شریعت کے ہلکے پھلکے اُصولوں پر عمل کرنا اور سخت اور ایثار طلب کاموں سے کترا جانا۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ۔ ﴿النساء:۷۷﴾

جہاد کی ضرورت سے اِنکار کرنا۔

وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۖۚ وَ قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ ﴿آل عمران:۱۶۷﴾

"خود رُکنے کے علاوہ دوسروں کو بھی میدان جنگ میں جانے سے

روکنا۔"

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ج وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (احزاب:۱۸)

۵۔ اسلامی انقلاب کی دعوت سے جو چیلنج انقلابی جماعت کے وجود کو نابود کرنے کے لئے پیدا ہوگا۔ صرف وہی چیلنج استقامت کو برقرار رکھوا سکتا ہے اور انحراف سے باز سکتا ہے۔ اگر استقامت نہ رہے تو انقلابی جماعت کا فنا ہو جانا ضروری ہے اور یہی وہ محرک ہے جو اپنی بقاء اور کامیابی کی ہر قیمت ادا کروا دے گا۔

۶۔ اِنقلابی قیادت کو ہر ردِ عمل کے جواب میں جو طرزِ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے:

(الف) مومنوں کی دِلنوازی، ان کے ایمان کی آبیاری اور انہیں معاشی اِستحکام عطا کر کے ان کی قوت سے اِنقلاب برپا کرے۔

(ب) منافقوں کی پردہ دری۔

(ج) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط (توبہ:۷۳)

"اے پیغمبرؐ کافروں اور منافقوں سے لڑو اور اُن پر سختی کرو۔"

اُمت مسلمہ کے موجودہ زوال سے نکلنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ:

- اُمت وجود میں کیسے آتی ہے؟
- کیسے ترقی کرتی ہے؟
- کیسے زوال پذیر ہوتی ہے؟

- زوال سے نکلنے میں کن موانع سے دوچار ہوتی ہے؟
- موانع پر غالب کیسے آسکتی ہے؟

اُمت از روئے قرآن پیغمبرانہ دعوت کی بنیاد پر پیغمبرانہ قیادت کے ساتھ وابستگی کی بنیاد پر اپنے اندر اجتماعی وحدت کا شعور پیدا کرکے وجود میں آتی ہے اور بتدریج ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی انفرادی زندگی کے نصب العین یعنی اِنسان مرتضیٰ بننے کی آرزو کے تحت پہلے زندگی اور کائنات کے باب میں بے مقصدی کے گمان پر غالب آئے۔ مقصدیت کا یقین راسخ پیدا کرے۔

حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت تذبذب سے نکل کر کامیابی کے حاصل ہو کر رہنے کا موقف اختیار کرے اور خواہشات کی بے اِنضباطی کو۔

ضبط و انقیاد میں بدل کر اپنے آپ کو اُمت مسلمہ کے رکن بننے کے وصف سے مزین کرے۔

اِجتماعی زندگی کے معاشرتی پہلو میں خودپسندی اور نسلی تفاخر کے احساس پر اخوت کے جذبے کو غالب کرے اور اپنے اخوت کے جذبے کو اس معیار پر پرکھے کہ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ اور معاشی پہلو میں حرص و لالچ اور بخل کے بجائے انفاق اور ایثار کا جذبہ پیدا کرے اور سیاسی پہلو میں ہوس اقتدار کے بجائے کلمہ طیبہ پر مبنی ایک معاہدۂ عمرانی وجود میں لائے جس کی رُو سے مطاع اور مطیع دونوں منزل من اللہ احکام کے یکساں واجب التعمیل ہونے کو ضروری سمجھ کر مطالبہ حقوق کے بجائے ایتائے حقوق کو اپنے لئے محرک عمل بنائیں --------- یہ جدوجہد ایک مثالی معاشرے کے مقام کی جدوجہد کے ضمن میں ہوسکے گی جس کے خصائص یہ ہیں کہ:

ا۔ وہ نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔

۲۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور رُوحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔

۳۔ جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں اور

۴۔ اِس معاشرے میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کی غیر مشروط اطاعت اور غیر منقسم وفاداری استحکام کی اساس متصور ہو۔

مگر بین الاقوامی زندگی جو عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کی مظہر ہے اور بین الاقوامی زندگی میں جو فساد کی بنیاد ریاست کا تصور ہے' کہ ریاست سیاسی اِعتبار سے منظم ایسے معاشرے کا نام ہے جسے اپنی بقاء اور توسیع کے لئے دوسری ریاستوں سے صلح اور جنگ کا اختیار حاصل ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ بین الاقوامی زندگی میں جنگ در جنگ کا طرزِ عمل برقرار رہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ انسانیت امن و عافیت سے محروم ہو جائے۔ اس صورت حال کا تدارک بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق کے قیام کے بغیر ممکن نہیں اور ایک دفعہ قرآن مجید کی رہنمائی سے دین حق کا غلبہ قائم ہو چکا ہے۔

غلبہ دین حق کا قیام بین الاقوامی سطح پر جس لائحہ عمل سے ہو گا وہ عالمی سطح پر انقلاب کا لائحہ عمل ہو گا جس کی وضاحت باب ششم میں کی گئی ہے مگر ایک عام انسان اس لائحہ عمل کے قابل عمل اور نتیجہ خیز ہونے کو باور کرنے کے لئے آمادہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن بنیادی تصورات کے مسخ ہو جانے سے بین الاقوامی سطح کے اِنقلاب کا نتیجہ خیز ہونا باور نہیں آتا ان کی وضاحت کی جائے۔ وہ بنیادی تصورات جن کے مسخ ہو جانے سے بین الاقوامی

اِنقلاب کی نتیجہ خیزی کا یقین متزلزل ہوا ہے اور اُن کے مسخ ہو جانے کے موجبات سے بحث کی جائے۔

وہ بنیادی تصورات یہ ہیں:

- الکتٰب کا بطور اصطلاح قرآنی کے مفہوم
- سنت کا قرآنی مفہوم
- تاریخ کا قرآنی مفہوم
- مضمرات تاریخ کا مسخ شدہ مفہوم

الکتٰب

• کا اطلاق ایک ایسے نظام پر ہوتا ہے جو:

۱۔ فکر و عمل دونوں کو محیط ہے اور انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی پہلوؤں کے نصب العین۔

۲۔ ان کے حاصل ہو کر رہنے کے یقین کی اساس

۳۔ ان کے حصول کے ضامن لائحہ عمل

۴۔ اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس

۵۔ عمل کو پرکھنے کے معیار

۶۔ اس معیار کے عمل میں ڈھل جانے کے نمونہ کمال اور عملی جدوجہد میں اِستقامت دلانے والے اور اِنحراف سے باز رکھنے والے محرک پر مشتمل ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ﴿یونس:۴۹﴾ اور

لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ○ ﴿رعد:۳۸﴾

کتاب کے یہ اجزائے ترکیبی "اجل" یعنی فیصلہ کن ساعت میں سرخرو ہونے کے شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب "کتاب" کا مفہوم آیات قرآنی کے حوالے کے بجائے لغت کے حوالے سے متعین ہوا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ:

۱۔ "کتاب" اوامر و نواہی کے لکھے ہوئے ضابطہ سے زیادہ متصور نہ ہو سکی۔

۲۔ اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد یہ ضابطہ بے اثر ہو گیا۔

۳۔ قرآن بحیثیت کتاب کے صحف ماسبق کی تمثیل پر متصور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

۴۔ صحف ماسبق کی تقدیر یہ تھی کہ اُن کی پیرو کوئی امت زوال میں مبتلا ہو جانے کے بعد بغیر نئی بعثت کے صرف اپنے صحیفے کے حوالے سے زوال سے نہ نکل سکی تھی۔

اس لئے مذہبی ذہن ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ کے زوال پر غالب آنے سے مایوس ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"سنت" کی حیثیت قرآن کے عین مطابق عمل کے نمونہ کمال کی ہے۔ مگر:

۱۔ فقہی زاویہ نگاہ کے تحت سنت کا مفہوم ایسے عمل کا ہو گیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور اسے جائز سمجھا۔ یوں "سنت" عزیمت کے بجائے رخصت میں تبدیل ہو کر رہ گئی اور یوں رسم و رواج

(Usage And Custom) کی حیثیت اختیار کر گئی۔

تاریخ قرآن کے نقطہ نگاہ سے تخلیقِ امم اور تجدید ملل کا عمل ہے اور اس حیثیت سے تاریخ حصولِ نصب العین کی جدوجہد نہیں کامیابی اور ناکامی کی آئینہ دار ہے۔

مگر جب سے ہم نے علم بالوحی کے مقابلہ میں انسانی استعداد کے زائیدہ علم کو اہمیت دی ہے' ہم تاریخ کو اقوام اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہ کا علم سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے ذہن میں تاریخ صرف زوال کی توجیہ کا علم ہو کر رہ گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے امام المؤرخین ابن خلدون بھی زوال کی توجیہ پر قناعت کرتے ہیں۔ اندریں صورت تاریخ کی حیثیت ولولہ کے سرچشمے کی حیثیت سے ختم ہو گئی ہے اور اسلام کی تاریخ اسلام سے ابا' انحراف' انکار' سرکشی اور بغاوت کی تاریخ متصور ہونے لگی ہے اور اس دور کے اصلاح و تجدید کے مدعی بھی تاریخ اسلام کو زوال ہی کی تاریخ سمجھتے ہیں۔

اگر ہم نے تاریخ اسلام کے دو ادوار (دورِ نبوت اور دورِ مابعد نبوت) پر تاریخ سلام کو مشتمل سمجھ کر دورِ نبوت کو مقصودِ بعثت کو پانے کی جدوجہد کا دور' اور دورِ بعد نبوت کو اس مقصد کے حصول کی جدوجہد سے پیدا ہونے والے فضائل کی کم و مس ناکامی اور کامیابی کے ساتھ حفاظت اور بازیافت کا دور سمجھا ہوتا تو تاریخ کا تصور اتنا مایوس کن نہ ہو گیا ہوتا۔

مضمرات تاریخ کے مسخ شدہ تصورات

کسی نصب العین کے حصول کی جدوجہد' جس سے تاریخ بنتی ہے' زمان و ن کے ماحول میں ممکن ہے۔ جب سورۃ فاتحہ' کی اس دعا کے تحت اھدنا الصراط

المستقیم کے (جس میں ماضی' حال اور مستقبل کے تمام مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہیں جس کا محتوی (Content) مقصودِ بعثت کی صراط مستقیم ہے) زوال پذیر ہو جائے تو عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد دوسروں کی کورانہ تقلید میں مکان (وطن) سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اور اب جب تک ہم مضمرات تاریخ پر از سرنو غور کر کے ان کی حیثیت متعین نہ کریں' امت مسلمہ کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد زوال سے نکلنا اور امت واحد کے دوبارہ اصول واحدہ کے حوالے سے اجتماعی شعور پیدا ہونا ناممکن نظر آنے لگا ہے۔ یہ ترقی نہیں ترقی معکوس ہے۔ تاریخ کے مضمرات (زمان و مکان) کی حیثیت کو دوبارہ صحیح بنیادوں پر استوار کئے بغیر ہمیں اپنا زوال سے نکل سکنا باور نہیں آسکتا۔ اس صورت حال میں فکری الجھنیں زیادہ دخیل ہیں جو بے یقینی کا باعث ہوتی ہیں۔

دور مابعد نبوت میں قرآن کے حوالے سے انقلاب لانے میں کیا موانع پیدا ہو گئے؟

ا۔ قرآن مجید دورِ مابعد نبوت میں صحیفہ انقلاب متصور ہونے کے بجائے لغت کے حوالے سے "کتاب" بمعنی اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ متصور ہونے لگا۔

۔ جب تک قانون کو اقتدار کی بنیاد پر قوت نافذہ میسر رہی' قانون سے فضائل حیات کی حفاظت ہوتی رہی۔ جب قانون قوت نافذہ سے محروم ہوا تو فضائل حیات کی حفاظت نہ کر سکا۔ اس لئے دورِ نبوت میں کتاب و سنت کی پیروی سے جو نتائج پیدا ہوئے انہیں پیغمبرانہ قیادت کی معجزہ کاری کا نتیجہ سمجھا جانے لگا اور ختم نبوت کے بعد معجزہ کار قیادت متصور نہیں

ہو سکتی لہذا خاطر خواہ نتائج کے پیدا ہونے سے مایوسی غالب آگئی۔

۴۔ علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے درمیان امتیاز کا شعور باقی نہ رہنے سے علم بالوحی علم تفسیر میں ڈھل کر بے اثر ہو گیا۔

۵۔ علم بالوحی کے علم الغایات ہونے سے صرف نظر ہو جانے کا اثر یہ ہوا کہ ذاتی جدوجہد جس کی نتیجہ خیزی کی ضمانت کائناتی قوانین میں تھی' بے نتیجہ نظر آنے لگی۔ کیونکہ کائناتی قانونین (قانون نشوونما' تاریخی قانون اور قانون سعادت و شقاوت) کا شعور زائل ہو گیا۔

۶۔ دورِ بعد نبوت میں تاریخ کا تصور مسخ ہو جانے سے اسلامی زندگی میں ولولے کا ایک سرچشمہ اس لئے ختم ہو گیا کہ تاریخ جو قرآنی استعداد کے زائیدہ علم کے تحت علم بالوحی کی رو سے تخلیق امم اور تجدید عمل کے عمل کی حیثیت رکھتی تھی اقوام اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہ کا علم منسوخ ہونے کی وجہ سے صرف زوال کی توجیہ کا علم بن کر رہ گئی۔ اور زوال کی توجیہ یہ قرار پائی کہ جب عصبیت زائل ہو جائے تو قومیں اور ان کی تہذیب زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اور یہ واضح نہ کیا جا سکا کہ عصبیت زائل کیسے ہوتی ہے؟ حالانکہ عصبیت اخلاق باللہ کے زوال سے زائل ہوتی ہے اور اخلاص باللہ کسی ولولہ انگیز نصب العین کی آرزو باقی نہ رہنے سے زائل ہو جاتا ہے اور دوبارہ آرزو کے پیدا ہونے سے بحال ہو جاتا ہے۔

معیار

معیار وہ اصول ہے جس کے حوالے سے تمام مساعی اور ہر جدوجہد کو پرکھا جانا چاہیے اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اب معیار کی دو حیثیتیں ہو جاتی ہیں:

۱۔ اخلاقیت کا معیار اور

۲۔ ہمہ گیر مثالی جدوجہد میں کامیابی کا معیار

اخلاقیت کا معیار

خیر' مستحسن اور لائق پسندیدگی تصور میں ہمارے لئے بالذات ایک کشش موجود ہے۔ ہم جو کچھ خیر (نیکی) سے اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نیک بننا چاہتے ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ﴿التین:۴﴾

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔"

کا یہی مطلب ہے۔

اخلاقیت کی ماہیت اصلی کیا ہے؟

نفسی نقطہ نگاہ سے خیر اخلاق کیا ہے؟

عقلی نقطہ نگاہ سے قانون اخلاقی کی ماہیت اصلیہ کیا ہے؟

خیر اخلاق کا معیار کیا ہے؟ اور

یہ کیاں حجتہ ہے؟

اخلاقی خیر کے تصور کا اطلاق ہمارے کردار کی بعض صورتوں پر کیوں ہوتا

ہے؟

اللہ پاک فرماتا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ ﴿الشمس:۷،۸﴾

فطرت انسانی میں بالفعل اور بالقوہ فطرت کی ثنویت اور ان کے درمیان تضاد سے حیات انسانی میں اخلاقی صورت حال (Moralsituation) پیدا ہوتی ہے جس میں:

۱۔ خواہش اور فرض کے درمیان کش مکش'

۲۔ غور وخوض کہ فاعل اخلاق خواہش کو پورا کرے یا فرض کو'

۳۔ دونیتوں میں سے ایک کا انتخاب یعنی حکم کی پیروی یا خلاف ورزی کی نیت کا انتخاب'

۴۔ اس انتخاب نیت کی تائید عزم'

۵۔ تعمیل

۶۔ نتیجہ فعل' پھر

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ۝

﴿القیمۃ:۱۴،۱۵﴾

کے مطابق اخلاقی قضیے کا صادر ہونا۔ یہ فاعل اخلاق کا "ضمیر" صادر کرتا ہے اس قضیے کے صادر ہونے پر معیار اخلاقی حکم ہے اور صادر شدہ فعل کی نیت اس قضیہ کی مصداق ہے کہ صدور فعل میں فاعل اخلاق کی نیت تعمیل حکم سے متعین ہوتی تھی یا خلاف ورزی سے اور طے پاتا ہے کہ نیت کا حکم کی تعمیل سے متعین ہونا

حسن نیت ہے اور خلاف ورزی سے متعین ہونا سوء نیت ہے۔

وہ اعمال جنہیں ہم اچھا کہتے ہیں وہ اس لئے اچھے ہیں کہ وہ کسی دوسری غایت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں یا وہ بذات خود اچھے ہیں۔ بہت سے اعمال ایسے اچھے ہیں کہ وہ بعض پسندیدہ نتائج کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ کیا اخلاقی حیثیت سے اچھے اعمال بھی اسی مفہوم میں اچھے ہیں؟ یہ سوال حل کرنے کے لئے ہمیں اپنے شعورِ اخلاقی سے فیصلہ طلب کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اعمال کی ٹھوس مثالیں اپنے سامنے رکھ کر اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیے کہ ہم ان اعمال کو کب اور کیوں اخلاقی حیثیت سے اچھا سمجھتے ہیں؟ اب ہم اخلاص' باضمیری' صدق' عدل اور سخاوت کو اخلاقی فضائل کی مثال کے طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اتباع میں عمل کرنا فرض ہے۔ پرخلوص' باضمیر' سچا اور عادل ہونا اخلاقی خیر ہے۔

ہم ایک مثال لیں:

مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں شہادت دوں۔ میں سچی سچی شہادت دیتا ہوں میں سچ کہہ دیتا ہوں اور جج کو ملزم کا مجرم ہونا ثابت ہو جاتا ہے اور وہ اُسے قید کرنے کا حکم صادر کر دیتا ہے۔ کیا میرا فعل اور جج کا فعل اخلاقی خیر ہے؟ فرض کیجئے کہ میں نے سچی گواہی اس لئے دی کہ ملزم میرا دشمن تھا اور جج نے سزا اس لئے دی کہ ملزم نے رشوت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یعنی میری حق گوئی اور جج کے انصاف کی غرض کچھ اور تھی۔ حق گوئی اور انصاف مقصود نہ تھا۔ وہ دونوں فعل کسی فائدے کے لئے تھے۔ کیا وہ اخلاقی خیر ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں!

اللہ پاک فرماتا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○

﴿المنافقون:۱﴾

"(اے محمد ﷺ) جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ درحقیقت' اللہ کے رسول ہیں۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔"

ازروئے قرآن جب تک واقعہ کے مطابق بیان کرنے کی نیت نہ ہو قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا کی پرخلوص تعمیل نہ ہو واقعہ کے مطابق بیان سچائی متصور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منافقین ازراہ نفاق رسالت کا اقرار کرتے ہیں' پرخلوص تصدیق کی غرض سے اقرار نہیں کرتے۔ لہٰذا منافقین جھوٹے ہیں۔

اخلاقی فضیلت کے خیر ہونے کا معیار "حکم" کی پرخلوص تعمیل ہے۔ اگر اخلاقی فعل خالصتہ حکم کی تعمیل کی نیت سے صادر ہو تبھی عمل خیر ہو گا۔ اگر حکم کی تعمیل خالص تعمیل کی نیت سے صادر نہ ہو تو ہرگز اخلاقی خیر نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے اخلاقی فضیلت کا معیار۔ خیر اخلاقی کا معیار۔ ایک اور حیثیت سے ہمہ گیر نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کا معیار یہ ہے کہ:

"انفرادی زندگی کا نصب العین انسان مرتضیٰ بننا ہے جس تک پہنچانے کے لیے ... قرآن کا ... ہے"

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ ﴿المزمل:۹﴾

اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے فکری پہلو کی بے مقصدی' مقصدیت میں' اور ایمانی پہلو کا تذبذب کامیابی کے ایمان بالغیب میں' اور اخلاقی پہلو کی خواہشات کی بے انضباطی ضبط وانقیاد میں تبدیل ہوگی تو جو کامیابی حاصل ہوگی اس کی طرف اشارہ اس آیت پاک میں ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○ ﴿الفجر:۲۷ تا ۳۰﴾

اجتماعی زندگی کا نصب العین مثالی معاشرے کا قیام ہے جس تک پہنچانے کے بارے میں قرآن کا دعویٰ ہے کہ:

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ○ ﴿الزخرف:۴۴﴾

جس کے حصول کی جدوجہد سے حیات اجتماعی کے معاشرتی پہلو میں خودپسندی اور تفاخر کے بجائے اخوت پیدا ہوگی اور معاشی پہلو میں حرص' لالچ اور بخل' انفاق ایثار اور احسان میں بدل جائے گا اور سیاسی پہلو میں ہوس اقتدار اور اس سے پیدا ہونے والے مطالبہ حقوق کی جگہ کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے وجود میں آنے سے سیاسی تناقض رفع ہو کر رہے گا اور مطیع اور مطاع دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام کے یکساں واجب التعمیل ہونے کے نتیجہ میں فرائض کی بجاآوری یعنی ایتائے حقوق کے محرک عمل بن جانے سے وہ معاشرہ وجود میں آئے۔ بغیر نہ رہ سکے گا جس کے خصائص سے باب پنجم میں بحث کی گئی ہے۔

بین الاقوامی زندگی کا نصب العین بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق ہے جس

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴿التوبہ: ۳۳﴾

جس میں کامیابی کا مظہر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع ہے اور انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی میں سے ہر پہلو کے نصب العین کا حیات ارضی میں حاصل ہو جانا ہی ہمہ گیر کامیابی کا قرآنی معیار ہے اور قرآن مجید کے حجۃ من بعد الرسل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے حیات ارضی ہی میں سب نتائج پیدا ہونے چاہئیں کیونکہ اللہ تعالٰی نے عناد باللہ کے انتقام اور اخلاص باللہ کے انعام کے علاوہ کوئی نتیجہ آخرت پر ملتوی نہیں فرمایا۔ مگر اس کی شرط یہی ہے کہ علم بالوحی کو علم لغایات اور حصول غایات کے ضامن لائحہ عمل کا علم سمجھ کر قبل از مرگ زندگی میں کامیابی کی آرزو اور اس آرزو کی تکمیل کی جدوجہد کی جائے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ
اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴿احزاب:۲۱﴾

محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیت

نمونہ کمال!

بعثت خاتم الرسل علیہ التسلیم والتحیہ کا مقصود حیات انسانی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا ہے۔ انقلاب کی ہمہ گیری یہ ہے کہ وہ زندگی کے انفرادی (ذہنی' ایمانی' اخلاقی) اجتماعی (معاشرتی' معاشی' سیاسی)' اور بین الاقوامی پہلوؤں کو محیط ہو۔

ذہنی انقلاب یہ ہے کہ کائنات اور اپنی زندگی کو بے مقصد تصور کرنے کے بجائے بامقصد تصور کیا جائے۔

ایمانی انقلاب یہ ہے کہ یقین اس قدر راسخ ہو کہ حجاب کے رفع ہو جانے سے بھی یقین میں اضافہ نہیں ہوگا جیسا کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: لَمْ ازدو یقیناً لو کشف الغطاء۔

"پردہ ہٹ بھی جائے تو بھی یقین اتنا ہی رہے گا جتنا اب ہے۔"

اور یقین کہ شہادت یہ ہے کہ جبلی داعیات پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت غالب ہو اور طبعی خواہشات پر یہ تاریخی تجربہ غالب ہو کہ کامیابی ضبط و انقیاد کی بدولت میسر آئی تھی اور نفسانی تقاضوں پر یہ شعوری تقاضا غالب ہو کہ ہر کامیابی کے لئے فضائل اخلاق ضروری ہیں۔

اخلاقی انقلاب یہ ہے کہ زندگی جو مجموعہ اضداد ہے رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ضبط و انقیاد کی پابند اور فضائل اخلاق سے مزین ہو جائے۔

اجتماعی زندگی جو اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے اور معاشرتی معاشی اور سیاسی پہلو رکھتی ہے وہ اپنے ہر پہلو میں انحراف سے نکل کر اطاعت میں ڈھل جائے معاشرتی پہلو میں انحراف' خود پسندی اور تفاخر ہے اور اطاعت یہ ہے کہ اِنَّمَا

اَلْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کی اساس پر اخوت کے معیار پر ڈھل جائے اور اخوت کا معیار یہ ہے کہ ایک فرد اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے جیسا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: لا یؤمن احدکم حتّٰی یحب لاخیہٖ مایحب لنفسہٖ ﴿حدیث﴾

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔"

زندگی کے معاشی پہلو میں حرص ولالچ اور بخل کا غلبہ ہے اور اس حالت کو بدل کر انفاق و ایثار اور احسان کے تقاضے پیدا کرنا ضروری ہے اور نیکی کا حصول اس وقت تک متصور نہیں ہو سکتا جب تک دوسروں کی زندگی سے معاشی رکاوٹ دور نہ کی جائے جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط ﴿آل عمران:۹۲﴾

"تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس میں سے انفاق نہ کرو جو تمہاری نظر میں پسندیدہ ہے۔"

جس کا مطلب یہ ہے کہ فاضل اخلاق کا انفاق اور اس انفاق سے مستفید ہونے والے کی معیشت باہمی جوابی اور وجوبی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

جب زندگی کا سیاسی پہلو ہوس اقتدار میں گرفتار ہو تو ہیئت سیاسیہ میں مطاع کو شہریوں سے اطاعت طلب کرنے کا جو قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے اس کے تحت ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے اطاعت طلب کی جائے تو ایک مستبد سیاسی نظام وجود میں آتا ہے جس کے محاصل لوٹ بن جاتے ہیں جس کی پولیس دہشت انگیزی بن جاتی ہے اور جس کی عدالتیں عدل و انصاف کی قربان گاہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی کا قیام عمل میں آئے تو مطیع اور مطاع دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام یکساں واجب التعمیل ہو جاتے ہیں اور ان احکام کی پیروی کا جو شعور فرائض کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اس سے مطیع اور مطاع کے حقوق ادا ہوئے بغیر نہیں رہتے اور فرائض کے محرک عمل ہونے کی صورت میں وہ فساد پیدا ہی نہیں ہوتا جو مطالبہ حقوق کے محرک عمل ہونے کی صورت میں حقوق کے درمیان تصادم کی بنا پر پیدا ہو کر رہتا ہے کیونکہ جو حقوق طلب کرتا ہے وہ بے نظامی پیدا کرنے والا متصور ہوتا ہے اور جس سے حقوق طلب کئے جاتے ہیں' وہ ظالم اور غاصب قرار پاتا ہے اور دونوں کو اپنے اپنے حقوق کے مطالبے پر اصرار ہوتا ہے۔ حق دراصل کسی مفاد کے واجب التکمیل ہونے کے شعور کا نام ہے اور فرض کسی حکم کے واجب التعمیل ہونے کے شعور سے عبارت ہے اور فرض اور حق باہمی جوابی اور وجوبی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حقوق کے بجائے خودساختہ حقوق رسم و رواج سے اخذ کئے جائیں اور جیسا حاکمہ حقوق کو خود متعین کرے تو دنیا کی کوئی ریاست نہ تو فلاحی ریاست بن سکتی ہے اور نہ دنیا کی کسی عدالت میں عدل گستری اور دادرسی متصور ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ منزل من اللہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ ظالم ہیں فاسق ہیں اور کافر ہیں اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب عدل و انصاف کی ذمہ داری خدا کے باغیوں کو سونپ دی گئی ہو۔

بین الاقوامی زندگی کی اصلاح طلب خاصیت یہ ہے کہ وہ عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ و رجنگ کا مظہر ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانیت امن و عافیت اور سکون و طمانیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اور جب تک تمام اقوام عالم اور پوری نوع انسانی بتمام و کمال مہذب نہ ہو جائے اس وقت تک بین الاقوامی زندگی

امن و عافیت سے محروم ہی رہے گی۔ اس لئے بین الاقوامی زندگی کو عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل جنگ در جنگ سے پیدا ہونے والے خوف و غم سے محفوظ کرنے کی ذمہ داری بھی خاتم الرسل علیہ التسلیم والتحیہ کو سونپی گئی جس کو پورا کرنے کی شرط یہ ہے کہ دین حق کو تمام ادیان پر یعنی بین الاقوامی زندگی پر غالب کر دیا جائے جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ ﴿الصف:۹، توبہ:۳۳﴾

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اسے غالب فرما دیں تمام ادیان پر اگرچہ یہ بات مشرکوں کو ناپسند ہو۔"

اور خاتم الامم اسی ہدایت اور دین حق کی وارث بھی ہے اور اس امانت کی ذمہ دار بھی ہے۔ زندگی کے ان سب پہلوؤں میں حتمی نتیجہ خیز انقلاب کی شرائط یہ ہیں کہ:

- اصلاح طلب خاصیت معلوم ہو۔
- اصلاح پذیری کا تصور پیش نظر ہو۔
- وہ نصب العین متعین ہو جس کے حوالے سے اصلاح ہو گی۔
- حصول نصب العین میں کامیابی کے یقین کی اساس مہیا ہو۔
- وہ لائحہ عمل میسر آئے جو خاطرہ خواہ نتائج کی ضمانت رکھتا ہے۔
- لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس فراہم ہو۔

- عمل کو پرکھنے کا معیار مہیا ہو۔
- ایسا نمونہ کمال پیش نظر رہے جو جدوجہد کے قابل عمل اور نتیجہ خیز ہونے کا اعتماد برقرار رکھے۔ اور
- ایسا محرک فراہم کرے جو اس جدوجہد کے اتمام کو پہنچنے تک انحراف نہ کرنے دے اور استقامت دلادے۔

بحیثیت ہادی اعظم اور قائد انقلاب کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ التسلیم والتحیہ وہ نمونہ کمال ہیں جو ان تمام شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ جن سے ہمہ گیر انقلاب وابستہ ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ کوہ فاراں کے پہلے وعظ سے شروع ہونے والی مشکلات' شعب ابی طالب میں محصور رہنے کے مصائب' طائف میں تبلیغ سے پیدا ہونے والی اذیتوں اور ان سب مشکلات کے مقابلے میں عزم و استقلال اور ہجرت کے بعد معاشرتی زندگی کے اخوت میں ڈھلنے اور معاشی پہلو میں دوسروں کی معاشی تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرکے انفاق و ایثار و احسان کے جذبے پر ہماری نظر ہو اور وہ معاہدۂ عمرانی ہمارے سامنے ہو جس کے نتیجے میں میثاق مدینہ مرتب ہوا جس کی بنیاد محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تھی جس کے بغیر اللہ کی اطاعت متصور نہیں ہو سکتی۔ جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایسے مطاع کی ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا نمونہ ہیں اور ہجرت سے فتح مکہ تک غزوات اور فتح مکہ سے حجتہ الوداع تک ہر قسم کے جہاد فی سبیل اللہ سے گزر کر جو کامیابی حاصل ہوئی وہ پیش نظر ہو جس کا مظہر خطبہ حجتہ الوداع ہے تو دین میں' ایمان میں' اخلاق میں' معاشرت میں' معیشت میں' بذل و عطا میں اور سیاسی نظم و ضبط میں اور بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق کے قیام میں عدیم النظیر اور بے مثال نمونہ کمال کی

حیثیت محمد رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴿الاحزاب:۲۱﴾

"تمہارے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی بہترین طریق زندگی ہے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے امت مسلمہ علم و یقین، اخلاق ضبط و انقیاد پر فائز ہوئی معاشرت میں نسلی تفاخر اور خودپسندی پر اخوت غالب آئی، معیشت میں حرص و لالچ اور بخل کی جگہ بذل و عطا نے لی، تخلیقی جدوجہد کا تعطل رفع ہوا۔ سیاسی پہلو میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے مطاع کی مثال پیش فرمائی جو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو اور بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین کے قیام میں خطبہ حجتہ الوداع ایک فاتح کی حیثیت سے بھی بے مثال نمونہ کمال ثبت کرتا ہے جس نے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کی توثیق ڈیڑھ لاکھ مخاطبوں سے چاہی اور وصول فرمائی۔

اللہ پاک ہمیں آپ ﷺ کے اسوۂ کاملہ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ

عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ ؕ ﴿یوسف:۱۰۸﴾

قرآنی دعوت

دعوت کا مفہوم

دعوت وہ عمل ہے جسے اتمام کو پہنچانے پر کوئی جماعت مامور ہو۔ جس کے نتیجے میں اس جماعت کو دوام و استمرار میسر آئے۔ جو اجتماعی ہیئت نوع انسانی کی وحدت کے اصول اور عالمگیر نظام فکر و عمل کی اساس پر قائم ہو' اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو اُسے دعوت و تبلیغ ہی کے ذریعہ دائمی زندگی میسر آتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے نظام فکر و عمل کی جامعیت اور ہمہ گیری زندگی کے منفرد اور مجموعی تقاضوں کی تکمیل کی ضامن ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کتاب و سنت کی خلاف ورزی کے باعث ایک دور میں زوال پذیر ہوئے تو کتاب و سنت ہی کی پیروی کی بدولت پھر عروج حاصل کر گئے۔ کبھی قرآنی نظام فکر و عمل کے ایک پہلو نے انہیں ولولہ عطا کیا کبھی دوسرے پہلو نے۔ غرض جس انداز کے موثرات' اختلال کا موجب ہوئے' ان کا تدارک کیا جا سکا۔ کبھی عقاید کے استحکام سے سیرت کی تشکیل کر کے اوامرونواہی کا پابند بنا کر' کبھی تشرع کے جواب میں بالقوہ فطرت کو نشوونما دے کر' شریعت کے اتباع میں از سر نو صدق و خلوص پیدا کر کے دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تجدید کی امنگ پیدا کی جاتی رہی۔ جب تک معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے ہاتھ میں رہی احیاء و تجدید کی مساعی بار آور ہوتی رہیں۔

مگر جب عالمی سطح پر معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے ہاتھ سے چھنی اور ہم

اخلاق اور معیشت کا باہمی' جواب اور وجوبی ربط برقرار نہ رکھ سکے تو ہمارا زوال ہوگیا۔ اور ہم بھی اس موقف کے زیراثر آگئے کہ معاشی تخلیق کا ہر عمل اخلاقی احتساب سے بالاتر ہے تو ہم دعوت و تبلیغ سے نتائج پیدا نہ کرسکے۔

ہماری تبلیغ بے اثر کیوں ہوگئی؟

اس سوال کے جواب کی شرط یہ ہے کہ پہلے ہم یہ طے کریں کہ "تبلیغ میں ہم پیش کیا کرتے ہیں؟"

بحالات موجودہ ہم عقاید میں مردہ مابعدالطبیعیاتی تصورات پر اصرار کرتے ہیں۔ عبادات میں بے جان رسوم و ظواہر کی تلقین کرتے ہیں جن کا اثر زندگی پر مرتب نہیں ہوتا اور معاملات میں ایسی فقہ کا پرچار کرتے ہیں جس کی خلاف ورزی کے بغیر زندگی کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

ایسا کیوں ہے؟

ہم انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیاز کا شعور اس لئے برقرار نہ رکھ سکے کہ ہم نے اس حقیقت کو نظرانداز کردیا کہ علم بالوحی کا وظیفہ تخلیق نتائج ہے اور ہم نے علم بالوحی کو جو غایت اور حصول غایت کے ضامن لائحہ عمل کا علم تھا' علم ماہیت قرار دے کر اس کا وظیفہ توجیہ و تعلیل قرار دیا۔ قرآنی علم کو علم تفسیر میں ڈھال کر توجیہ و تعلیل پر قناعت کرلی جس کے بعد تمام نتائج کو آخرت پر ملتوی کرنا لازم آیا حالانکہ کتاب و سنت ہی کی پیروی سے بعثت سے حجتہ الوداع تک کے دورِ رسالت میں تمام نتائج حیات ارضی ہی میں بروئے کار آگئے تھے۔

اب جب تک موجودہ عقیم نظام دعوت و تبلیغ کو بدلا نہ جائے اس سے کوئی دینی ولولہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے امام مالکؒ کے اس

قول کے حوالے سے نظامِ تبلیغ کو بدلنا ہوگا:

لَنْ يُصْلِحَ هٰذِهِ الامة الا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ﴿قول امام مالک﴾

"اس امت کی اصلاح نہیں ہو سکتی بجز اس طریقہ کے جو دورِ اول کا تھا۔"

دورِ اول کا طریقہ کیا تھا؟ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے تین جزو ہیں:

ذات و صفات باری کا اثبات

عبادت و استعانت کا اقرار اور

ہدایت کی دعا

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ﴿فاتحہ: ۵﴾

جس میں ماضی' حال اور مستقبل کے تمام مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہیں۔ اس دعا میں معنی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جب اس دعا کا محتوی (Content) مقصود بعثت کی صراط مستقیم کو قرار دیا جائے۔

مقصودِ بعثت کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿توبہ: ۳۳' صف: ۹﴾

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا کہ اسے غالب فرما دے تمام ادیان پر'

اگرچہ یہ بات مشرکوں کو ناپسند ہو۔"

اس کے لئے مثالی معاشرے کا قیام ضروری ہے جس کے خصائص یہ ہیں کہ:

۱۔ وہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴿النساء:۱﴾

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔"

۲۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴿آل عمران:۱۱۰﴾

"جتنی امتیں (قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

۳۔ جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ ﴿البقرہ:۳۸﴾

"جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی

پیروی کرنا کہ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ
خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے۔"

ایسے معاشرے کے قیام کے لئے ہدایت دینے کے بارے میں قرآن کا اپنی نسبت دعویٰ ہے:

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ج ﴿الزخرف: ۴۴﴾

"یقیناً وہ (قرآن) ہدایت ہے آپ ﷺ کے لئے اور آپ
ﷺ کی قوم کے لئے۔"

لہٰذا انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جن تمام مسائل کا حل قرآن سے بحیثیت علم الغایات کے میسر آنا چاہیے وہ کیا ہیں؟ اور ان کا حل کیا ہے؟
علم بالوحی کے علم الغایات ہونے کے نقطہ نگاہ سے مسائل یہ ہو جاتے ہیں۔

انفرادی زندگی کے تینوں پہلوؤں (فکری' ایمانی' اخلاقی)
میں سے ہر ایک کی اصلاح طلب خاصیت اور اس کی اصلاح
پذیری کیا ہے اور ان کی اصلاح کس نصب العین کے حصول کی
جدوجہد کے حوالے سے ہوگی؟

اجتماعی زندگی' اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے۔ اس کے بھی تین پہلو ہیں:

۱۔ معاشرت

۲۔ معیشت

۳۔ سیاست

ان میں سے بھی ہر ایک کی اصلاح طلب خاصیت اور اس کی اصلاح پذیری

کا تصور کیا ہے؟ اور کس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے حوالے سے ان پہلوؤں کی اصلاح ہو گی؟

بین الاقوامی زندگی عداوت' عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کی مظہر ہے۔ اس کی اصلاح طلب خاصیت اور اس کی اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے؟

یہ ہیں وہ سوالات جن کے جوابات نصوص قرآنی کی شکل میں بغیر تفسیر کے' بغیر تعبیر کے' بغیر تاویل کے' بغیر توجیہ کے' بغیر تعلیل کے فقط قرآنی ریسرچ سے میسر آنے چاہئیں۔

فکری پہلو کی اصلاح طلب خاصیت زندگی اور کائنات کو بے مقصد سمجھنا ہے جس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ زندگی اور کائنات کی نسبت یہ یقین راسخ ہو کہ ان کا ایک سنجیدہ مقصد ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ ﴿الجاثیہ:۲۲﴾

"اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور تاکہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

۲۔ ایمانی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت تذبذب میں مبتلا ہونا ہے اور اس کی اصلاح پذیری ان نتائج کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت ایمان بالغیب کا راسخ ہونا ہے جو ابھی غیب میں ہیں۔

۳۔ اخلاقی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت خواہشات کا بے انضباط اور بے انقیاد ہونا ہے اور اس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ خواہشات ضبط و انقیاد کی پابندی ہو جائیں۔

یہ اصلاح کیسے ہو گی؟

قرآن مجید انفرادی زندگی کے ان تینوں پہلوؤں کی اصلاح "انسان مرتضیٰ" بننے کے نصب العین کی جدوجہد کے حوالے سے کرنا چاہتا ہے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کی رہنمائی کے بارے میں اپنی نسبت قرآن کا دعویٰ ہے:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿مزمل:۱۹﴾

"یہ قرآن تو نصیحت ہے سو جو چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لے۔"

اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس اس کائنات کی عدم محض سے تخلیق میں مضمر ہے کہ یہ کائنات پیغمبرانہ انقلاب کی نتیجہ خیزی کی ضمانت لئے ہوئے ہے۔(۱)

اس نصب العین کے حصول کے ضامن لائحہ عمل سے متعلق بحث پہلے کی جا چکی ہے۔(۲)

(۱) ملاحظہ ہو باب اول (تصورِ کائنات) منہاج القرآن۔

(۲) ملاحظہ ہو باب چہارم (انفرادی نصب العین کا منہاج۔)

اس عمل کو پرکھنے کا معیار ایک طرف منزل من اللہ "حکم" ہے اور دوسری طرف اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کے وہ نتائج ہیں جو دورِ رسالت میں میسر آئے تھے۔ جو دعوت و تبلیغ کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تبلیغ

ضروری ہے۔ جن کی پر خلوص بجاآوری کی شرط "یز کیکم" کے حوالے سے "تزکیہ" ہے جس کا مفہوم ان میلانات پر غالب آنا ہے جو تعمیل "حکم" میں مزاحم ہو سکتے ہیں۔

اجتماعی زندگی جو معاشرتی' معاشی اور سیاسی پہلوؤں پر مشتمل ہے اس میں:

۱۔ معاشرتی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت نسلی تفاخر اور خودپسندی ہے اور اس پہلو کی اصلاح پذیری کا تصور یہ ہے کہ خودپسندی کے بجائے "اخوت" کا جذبہ پیدا ہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴿الحجرات:۱۰﴾

"یقیناً مومن بھائی بھائی ہیں۔"

"اخوت" کا معیار یہ ہے کہ ایک مومن اپنے مومن بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یحب لاخیہ مایحب لِنَفْسِہٖ ﴿حدیث﴾

۲۔ معاشی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت حرص و لالچ اور بخل میں مبتلا ہونا ہے۔ اور اس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ حرص و لالچ اور بخل کے بجائے انفاق' ایثار اور احسان کا تقاضا غالب ہو۔

۳۔ سیاسی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت ہوس اقتدار ہے۔ اگر ہوس اقتدار پر قابو نہ پایا جا سکے تو ظالمانہ سیاسی نظام پیدا ہوگا جس میں مطالبہ حقوق محرک عمل ہوگا۔ اس کی اصلاح پذیری یہ ہوگی کہ میثاق مدینہ کی تمثیل پر کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی وجود میں لایا جائے جس کی رُو سے مطاع اور مطیع دونوں اس کے پابند ہوں کہ منزل من اللہ احکام ان کے لئے یکساں واجب التعمیل ہیں۔ جس کے بعد مطالبہ

حقوق کے بجائے فرائض کی بجاآوری یعنی ایتائے حقوق محرک عمل بن جائے تا کہ طبقات کے درمیان وہ تصادم جو مطالبہ حقوق سے پیدا ہوتا ہے پیدا ہی نہ ہوسکے۔

انفرادی زندگی کی اصلاح مثالی معاشرے کے قیام سے معاشرتی پہلو میں "اخوت" معاشی پہلو میں انفاق و ایثار و احسان اور سیاسی پہلو میں ہجرت کے بعد سے مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں فتح مکہ تک مثالی معاشرہ وجود میں آگیا اور بین الاقوامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے لئے تیار ہوسکا۔ یہ کیونکر ہوا؟ بین الاقوامی نصب العین کے لائحہ عمل کی بحث میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

فطرت انسانی کے بالفعل اور بالقوہ پہلوؤں کے درمیان ثنویت اور تضاد کی بنا پر زندگی کے کسی بھی نصب العین اور اس کی حفاظت کی شرائط سے صرف نظر ہو جانے کی صورت میں زوال میں مبتلا ہو جانا ضروری تھا اور اب جس صورت حال سے امت مسلمہ دوچار ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر فساد بین الاقوامی سطح سے پیدا ہو رہا ہے اور تمام اجتماعی ہیئتیں بین الاقوامی صورت حال سے مغلوب ہونے کی بنا پر تباہ حال ہیں اور افراد اجتماعی زندگی کے غلط ہو جانے کے باعث تباہ ہیں۔ تو ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ موجودہ صورت حال میں ہمارا نجات اخروی کی طرف مائل ہونا علم بالوحی کی نتیجہ خیزی کے یقین سے محروم ہو کر مایوسی میں مبتلا ہو جانے کا رد عمل ہے ہرگز قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی پر ایمان کا نہیں کیونکہ یہ ہدایت قبل از مرگ زندگی میں حیات ارضی کی بین الاقوامی' اجتماعی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کے لئے نازل ہوئی تھی۔

لہذا ہمیں حق پہنچتا ہے کہ زندگی کی جس سطح سے شر و فساد پھیل رہا ہے اس کا علاج قرآن کی رہنمائی سے طلب کریں اور ہماری زندگی میں وہ خرابی جس نے ہمیں اس صورت حال کا علاج کرنے کی اہلیت سے محروم کیا ہے وہ صرف عالم اسلام

کا متحد نہ ہونا ہے۔

اگر انسان مرتضٰی بننے کی جدوجہد سے انفرادی زندگی کے تینوں پہلو اصلاح پذیر ہوتے تھے اور مثالی معاشرے کے قیام کی آرزو کے تحت حیات اجتماعی کے معاشرتی' معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی اصلاح بین الاقوامی سطح پر غلبہ دین حق کے لئے درکار تھی تو ہمیں اپنی دعوت و تبلیغ کو بین الاقوامی نصب العین اور اس کے حصول کے ضامن لائحہ عمل کو اولین اور اہم ترین حیثیت دے کر زندگی کے اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں کی اصلاح کو بین الاقوامی مقصود سے مربوط کرنا ہی پڑے گا۔

دعوت و تبلیغ کے جس نظام کو قرآنی دعوت و تبلیغ کا نظام کہنے میں ہم حق بجانب ہوسکتے ہیں اس کے اجزائے ترکیبی صرف یہی ہوسکتے ہیں:

نصب العین

غلبہ دین حق کے لئے مثالی ہیئت اجتماعیہ کا قیام اور اس کے لئے انفرادی زندگی میں انسان مرتضٰی بننے کا نصب العین۔

حکمت قرآنی

ان غایات کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین کی اساس۔

لائحہ عمل

ان غایات کے حصول کا ضامن لائحہ عمل۔

عملی اساس

اس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس۔

معیار

اس عمل کو پرکھنے کا معیار۔

نمونہ کمال

اس معیار کے واقعہ بن جانے کا نمونہ کمال۔

محرک

جو جدوجہد میں استقامت عطا کرے اور انحراف نہ کرنے دے۔

قرآن مجید کا سرچشمہ وحی ہے۔ وحی سے میسر آنے والے علم کو علم ماہیت میں ڈھال کر اس کی بے تاثیری کا مشاہدہ دو تین صدیوں تک ہم کر چکے۔

تجربی توثیق و شہادت سے بڑھ کر یقین انگیزی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر علم بلوجی کو از سر نو علم الغایات مان کر اور تخلیق نتائج کو اس کا وظیفہ سمجھ کر اس کی نتیجہ خیزی کے شرط کو پورا کریں تو آج بھی ہم قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا چیلنج (Challange) قبول کرنے کے منصب پر فائز ہو سکتے ہیں۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

يَآأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَٰفِرِينَ ﴿المائدہ:٦٧﴾

"اے رسول ﷺ! جو ارشادات خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہوئے سب لوگوں کو پہنچادیں۔ اگر ایسا نہ کیا تو آپ ﷺ خدا کے پیغام پہنچانے سے قاصر رہے یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ

کیا۔ اور خدا تم ﷺ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بے شک
خدا منکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

ما انزل الیک میں مذکورہ بالا تمام محتویات دعوت شامل ہیں اور اس خطاب کے مخاطب مومنین بھی ہیں کیونکہ رسالت کی حیثیت نظام کائنات میں ایک ایسے ادارے کی ہے جس کے ذریعہ امت کے مفاد کے لئے حالات میں تصرف کیا جاتا ہے۔

اسی لئے دعوت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے ایک جماعت بھی ضروری ہے جس کی احتیاج کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

﴿آل عمران:۱۰۴﴾

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی
طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں
سے منع کرے۔ یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔"

دعوت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ موضوعات تبلیغ ہی پر نہیں بلکہ طریق تبلیغ پر بھی اصرار ضروری ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○ ﴿النحل:۱۲۵﴾

"اے پیغمبر ﷺ! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے
پروردگار کے راستہ کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریقہ سے
ان سے مناظرہ کرو جو اس کے راستہ سے بھٹک گیا تمہارا
پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو راستہ پر چلنے والے ہیں
ان سے بھی خوب واقف ہے۔"

اگر ہم نے تاریخ کے موجودہ دور میں موثرات اختلال کے تدارک کے سلسلے میں قرآن مجید کے اپنی نسبت "کتب متشابہات" ہونے کے دعوے کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو ہماری سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ:

اخلاق اور معیشت کے درمیان ربط

تاریخی قانون اور قانون سعادت و شقاوت کے درمیان
ربط' اور تکمیل دین کے قرآنی تصور اور قرآن مجید کے حجتہ
"من بعد الرسل" ہونے کے درمیان ربط۔
کا دعوت کی نتیجہ خیزی سے کتنا تعلق ہے۔

اخلاق اور معیشت

کتاب متشابہات (ملتی جلتی سچائیوں کی حامل کتاب) سے دورِ رسالت ﷺ میں فضائل اخلاق کی تلقین سے معاشی حالات خودبخود اس لئے بہتر ہو گئے تھے کہ ازروئے قرآن لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ کے حوالے سے ذعل اخلاق کا عمل انفاق جو اس کی نیکی تھی' اس کے انفاق سے مستفید ہونے والے کی معیشت پر ناگزیر انداز اثر رکھتا تھا۔ مگر ہمارے زوال سیرت کے بعد جب ہمارے

ذہنوں میں فاعل اخلاق کی نیکی کا تعلق دوسروں کی معیشت کے ساتھ برقرار نہ رہ سکا اور اخلاقی جدوجہد بے نتیجہ ہونے لگی تو تاریخی تغیرات سے ہمارے شعور پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ معاشی پہلو کے تقاضوں کا پورا ہونا بجائے خود نہایت اہم ہے۔ معاشی پہلو کی اس اہمیت کا شعور ہمیں اخلاق کی طرف متوجہ کرسکتا ہے مگر سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اشتراکی نظام کا معاشی پہلو پر اصرار ہرگز ہرگز اخلاقی شعور کی بیداری اس لئے متصور نہیں ہوسکتا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کا مسلمہ یہ ہے کہ اخلاق اور معیشت کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے اور معاشی تخلیق کا ہر عمل اخلاقی احتساب سے بالاتر ہے کیونکہ یہ دونوں سرمایہ دارانہ نظام ہیں ایک وسائل تخلیق کی انفرادی ملکیت کی سرمایہ داری ہے اور دوسری اجتماعی ملکیت کی سرمایہ داری ہے۔

تاریخی قانون اور قانون سعادت و شقاوت

تاریخی قانون حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان تضاد و تصادم کا قانون ہے جس کے نتیجے میں حزب اللہ ہی کو غلبہ حاصل ہونا چاہیے اور حزب الشیطان ہی کو شکست ہونی چاہیے۔ اس کی ضمانت اس قانون سعادت و شقاوت میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴿الشمس: ۹، ۱۰﴾

”جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ سے پاک کیا وہ فلاح پا گیا
اور جس نے اپنے نفس کو مٹی میں ملایا یعنی حرص و لالچ میں مبتلا
رکھا وہ تباہ ہوگیا۔“

کیونکہ جس کا نفس حرص و لالچ سے پاک ہوگا وہی دوسروں کو نفع بخشی اور

فیض رسانی کرے گا اور نشوونما دے گا اس لئے فلاح پائے گا اور جو اپنے نفس کو حرص و لالچ میں مبتلا رکھے گا وہ نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما کو روکے گا اس لئے تباہ و برباد ہو گا۔

تکمیل دین اور قرآن کا حجتہ من بعد الرسل ہونا

تکمیل دین کا دعویٰ حجتہ الوداع کے دن کیا جا رہا ہے۔ تکمیل دین یہ ہے کہ نوع انسانی نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز کر دی گئی ہے اس لئے خاتم الانبیاء کے بعد اب نئی بعثت کے بغیر ہی فقط کتاب و سنت کی پیروی کے ذریعے امت اور انسانیت کا زوال و انحطاط سے نجات حاصل کرنا ممکن ہو گا جبکہ امم سابقہ میں امتوں کے زوال اور عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ بغیر نئی بعثت کے نہیں تھا۔ اب نئی بعثت کی احتیاج سے امت مسلمہ اور انسانیت کے بے نیاز ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت کی پیروی ہی سے وہ تمام نتائج پیدا ہو سکیں گے جو نئی بعثت سے پیدا ہوتے تھے اسی لئے قرآن حجتہ من بعد الرسل ہے۔

باب ۱۱

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا
يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط
وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ط ﴿ہود: ۱۱۸۔۱۱۹﴾

قرآن تاریخ ہے

دراصل تاریخ کے تین تصور ہیں:

(الف) تاریخ واقعات ماسبق کا بیان ہے جس کے قابل اعتماد ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہو اور غائی (Axiological) نقطہ نگاہ سے سازگار ہو اور اس باب میں ہر شک و شبہ سے بالاتر اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔

(ب) تاریخ قوموں اور تہذیب کے عروج و زوال کی توجیہ کا علم ہے۔ انسانی استعداد کا زائیدہ تصور تاریخ ہے جس کے تحت تاریخ کے پانچ نظریے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ تاریخی حرکت میں نہ عروج ہے نہ زوال ہے۔ تاریخ کا یہ نظریہ میکانی نظریہ کائنات (Mechanistic View Of The Universe) سے پیدا ہوتا ہے کہ نظام کائنات میں کوئی مقصود مضمر نہیں ہے اس لئے تاریخی حرکت میں نہ عروج ہے نہ زوال۔

۲۔ تاریخی حرکت انسانیت کو اس کے زوال کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ نظریہ مسیحی علم کلام کے زیر اثر "معصیت اولیٰ" کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ تاریخی حرکت انسان کو عروج کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ نظریہ حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی دو تعبیریں ہیں:

(الف) تاریخی حرکت خط مستقیم کی صورت میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جدید ترین ہی کامل ترین ہے۔

(ب) تاریخی حرکت فی الجملہ عروج کی حرکت ہے مگر ہر مرحلے میں بے شمار نشیب و فراز ہیں۔

۴۔ تاریخی حرکت تصورات کی جدلیت کا نتیجہ ہے جس کے تین مدارج ہیں:

۱۔ اثبات (Thesis)

۲۔ نفی (Antithesis) اور

۳۔ تطبیق (Synthesis)

اس نظریے کا بانی ہیگل ہے۔

۵۔ تاریخی حرکت معاشی طبقات کی کش مکش سے پیدا ہوتی ہے یہ نظریہ کارل مارکس نے پیش کیا ہے جو مادی جدلیت کی حیثیت سے ہیگل کے مقابلے میں نفی یعنی (Anti Thesis) کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر ان سب نظریات کی رُو سے تاریخی حرکت کا رُخ بدلنے کا کوئی امکان متصور نہیں ہوتا۔

ج تاریخ کا تیسرا تصور قرآن سے میسر آتا ہے جس کی رُو سے تاریخ تخلیق اقوام اور تجدید ملل کا عمل ہے جس کا طریق کار یہ ہوگا کہ حیات بخشی کے ضامن نصب العین کے حوالے سے انقلاب برپا کرکے زوال کا رُخ عروج کی جانب پھیرا جا سکے گا۔

قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی حرکت پر مشتمل عمل، تاریخ کا موضوع ہے۔ تاریخ کا مسئلہ یہ ہے کہ:

قوموں اور تہذیبوں کا عروج و زوال کیسے ہوتا ہے؟
وہ قانون کیا ہے جو عروج و زوال کی تاریخی حرکت پر اثرانداز ہوتا ہے؟ اور اس قانون کو سمجھ کر تاریخ کا رُخ بدلنا ضروری ہو تو مسئلہ یہ ہوگا کہ تاریخی حرکت کا رُخ مطلوبہ سمت میں کیونکر پھیرا جاسکتا ہے؟

قرآن مجید اُمم سابقہ کے عروج و زوال کے بیان میں اس قانون کی نشاندہی کرتا ہے جو تاریخی حرکت کے نتائج کو متعین کرنے میں موثر ہے۔ اگر کفار و مشرکین قرآن مجید کو اساطیر الاولین کہہ کر نظرانداز کرنے کی کوشش اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اپنے مزعومہ مفادات کی وجہ سے مفاد پرستانہ تخریب میں مبتلا ہوتے ہیں اُمم سابقہ کے حالات اور اُن کے زوال کے اسباب کو سن کر وہ اس رائے کو گوارا نہیں کرتے کہ ہم جس انداز کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تباہی کی طرف لے جائے گی۔

قرآن مجید انبیائے سابقین کے قصے بیان کرکے یہ یقین دلاتا ہے کہ حق و باطل کی کش مکش میں غلبہ ہمیشہ اصحابِ حق ہی کو حاصل ہوتا رہا ہے اور حق ہی غالب ہو کر رہے گا۔ اس حتمیت کے ساتھ غلبہ حاصل ہونے کا یقین میسر آنے کی بنیاد تضاد کا وہ قانون ہے جس سے تاریخی حرکت کے نتائج کی توجیہ کی جاتی ہے۔ اس انداز سے غور کرکے نتائج اخذ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو متضاد نظریوں کی علمبردار متخاصم اور معاند قوموں کی وحدت کی علیحدہ علیحدہ اساس اور ان کا منتہائے مقصود

متعین کر کے ضبط و انقیاد اور اختلال انگیزی کے موثرات کا تجزیہ کیا جائے اور غایت کے قریب تر یا دور ہوتے چلے جانے کی توجیہ کے لئے اس قانون کو متعین کیا جائے جس سے نتیجے کے طور پر عروج یا زوال پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں بعض انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کا حال اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اُمم سابقہ کے عروج و زوال کا قانون واضح کیا جائے۔ واقعات کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے ہی کی وجہ سے بعض مفسرین نے "اسرائیلیات" سے تفصیلات مہیا کرنے کی سعی کی ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴿المومن:۷۸﴾

"تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے اور بعض کے نہیں بتائے ہیں۔"

انبیائے سابقین کے اخبار کے قرآن مجید میں بار بار دُہرائے جانے کا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴿ہود:۱۲۰﴾

"اور اے محمد ﷺ! یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو

مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تمہیں حقیقت کا علم ملا اور
ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔"

مگر ان اخبار سے تسکین صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ہر قصے سے یہ نتیجہ برآمد ہو کہ غلبہ اصحابِ حق ہی کو حاصل ہو گا۔ اور یہ نتیجہ صرف اسی صورت میں اخذ کیا جا سکتا ہے جب قوموں کے اعمال کے نتائج اور تہذیبوں کے عروج و زوال کسی ایسے قانون سے متعین ہوتے ہوں جس میں اس کی ضمانت ہو کہ غلبہ ہمیشہ صرف اصحابِ حق ہی کو حاصل ہو گا۔ اور تب ہی ہو سکے گا جب تاریخی عمل کسی ناقابل شکست قانون سے متعین ہوتا ہو۔ یعنی جو تاریخی جدوجہد زمان و مکان میں ہو رہی ہے اُس کے نتائج کسی قانون سے متعین ہو رہے ہوں اور یہ قانون وہی قانون ہونا چاہیے جو کونیاتی سطح پر نتائج پیدا کر رہا ہے۔ وہ قانون تضاد ہی کا قانون ہے اور جس صورت حال میں قرآنی ہدایت کی احتیاج پیدا ہوتی ہے وہ مفاد پرستانہ تخریب سے پیدا ہونے والے تضاد اور کشمکش کی صورت حال ہے۔ وہ نصب العین جو انسانیت کی احتیاج ہے جسے حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید ہدایت کا دعویٰ کرتا ہے۔ جس کے حصول کی جدوجہد پر تاریخ مشتمل ہے۔ جو بعثت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا مقصود ہے اور جو بعینہٖ قرآنی وحی کے بھی نازل ہونے کا مقصود ہے' ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جو

ا۔ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو جیسا کہ اس آیہ مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

﴿النساء:١﴾

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔"

۲۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط ﴿ال عمران:۱۱۰﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو' نیکی کا حکم دیتے ہو' برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

۳۔ جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں کو ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رکھیں۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O ﴿البقرۃ:۳۸﴾

"پس میرے پاس سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی۔ پھر جو کوئی ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ خوف ہوگا نہ غم۔"

ا۔ جس کے استحکام کی اساس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی خالص وفاداری ہو جس میں شرک فی النبوت کا شائبہ نہ ہو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴿آل عمران:۳۱﴾

"فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔"

۲۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴿ال عمران:۱۱۰﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو' نیکی کا حکم دیتے ہو' برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

۳۔ جن کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں کو ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رکھیں۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ ﴿البقرۃ:۳۸﴾

"پس میرے پاس سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی۔ پھر جو کوئی ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ خوف ہوگا نہ غم۔"

۴۔ جس کے استحکام کی اساس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی خالص وفاداری ہو جس میں شرک فی النبوت کا شائبہ نہ ہو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴿آل عمران:۳۱﴾

"فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔

اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

ایسے مثالی معاشرے کے باقی رہنے اور ترقی کرنے کی شرط یہ ہے کہ معاشرہ پیغمبرانہ بعثت کے مقصود کو جس کی خاطر قرآن مجید نازل ہوا' حاصل کرنے کے لئے اس ہدایت کی پیروی کرے جیسا کہ اس آیہ پاک سے واضح ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴿الصف:۹﴾

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر۔ اگرچہ یہ بات مشرکوں کو ناپسند ہو۔"

اور یہ واقعہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اس غایت کو حاصل کرنے پر ہم مامور ہیں' اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے:

لا يؤمن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به ﴿حدیث﴾

کہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی آرزو میں جو کچھ میں لایا ہوں' اس کی پیروی کرنا نہ ہو جائے۔"

اگر یہ بات صحیح ہو تو ہمیں اس حتمی اور قطعی اعتقاد کے متضمنات کو پانے کی جستجو کرنی چاہیے جو اس آیہ پاک میں پایا جاتا ہے۔

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴿الصف:۹﴾

"تا کہ وہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر اگرچہ یہ بات

مشرکوں کو ناپسند ہو۔"

یہ حتمی اور قطعی یقین اولاً تو غایت تخلیق کائنات' غایت بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غایت نزول وحی قرآنی کے عین یکدیگر ہونے میں مضمر اور ثانیاً اس بات میں کہ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ قانون جو کائناتی نظام میں نتائج کو متعین کر رہا ہے جو نظام تکوینی میں مضمر ہے جس قانون ربوبیت سے کائنات کی نشوونما کے نتائج متعین ہو رہے ہیں اور جس قانون سعادت و شقاوت سے انسانوں کی کامیابی اور ناکامی متعین ہوتی ہے' جس تاریخی قانون سے اخلاقی جدوجہد کو محرک میسر آتا ہے ان میں ایک بنیادی ربط کو سمجھا جائے' لہٰذا سوالات یہ ہیں کہ:

- وہ کائناتی قانون کیا ہے جو انسانیت کی نشوونما کو متعین کرتا ہے؟
- وہ بنیادی اخلاقی قانون کیا ہے جو انسان کی اخلاقی جدوجہد کے نتائج متعین کرتا ہے اور
- وہ تاریخی قانون کونسا ہے جو تاریخی حرکت کے نتائج کو متعین کرتا ہے اور
- ان قوانین کے درمیان ہم آہنگی کا مطلب کیا ہے؟

وہ قانون ربوبیت یا نشوونما کا کائناتی قانون جس سے کائناتی سطح پر نشوونما کا عمل متعین ہوتا ہے مندرجہ ذیل آیات سے اخذ کیا جا سکتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ

الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ○ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿البقرہ﴾

"اور جب آپ ﷺ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ضرور ایک نائب پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا "اے اللہ! خونریزی کرے گا اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔" (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا' جو میں بالیقین جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اور سکھا دیئے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء۔ پھر پیش کیا فرشتوں کے سامنے۔ پھر فرمایا مجھے بتاؤ ان کے نام اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا' (یا اللہ) پاک ہے تو اور ہم نہیں جانتے بجز اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا۔ یقیناً تو علیم و حکیم ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: "اے آدم! بتا دے اُن کو اُن کے نام۔" پھر جب بتا دیئے اُن کو اُن کے نام (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اور جانتا

ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔"

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ○ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ○ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴿البقرہ:۳۴تا۳۹﴾

"اور جب کہا ہم نے فرشتوں سے سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ کیا سب نے سوائے ابلیس کے۔ اس نے اِبا کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا کافروں میں سے۔ اور ہم نے کہا اے آدم! تو اور تیری زوجہ رہو جنت میں اور کھاؤ اس میں فراغت سے جہاں سے چاہو۔ اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے' پھر ہو جاؤ گے ظالموں میں سے۔" پھر بہکایا ان کو شیطان نے اُس سے پھر نکال دیا اُن کو وہاں سے جہاں وہ تھے۔ ہم نے کہا اُترو۔ تم میں سے بعض

بعض کے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لئے زمین میں مستقر ہے اور
متاع ایک وقت تک۔ پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے
بعض باتیں۔ اس کے بعد پھر آیا اس پر سے یقیناً وہی لوٹانے والا
رحیم ہم نے کہا اُترو یہاں سے سب' پس میری طرف سے
تمہارے پاس ہدایت آئے گی' پھر جو کوئی پیروی کرے میری
ہدایت کی انہیں نہ خوف ہو گا نہ غم اور جن لوگوں نے کفر کیا
اور جھٹلایا ہماری آیات کو' وہی لوگ اصحاب النار ہیں۔ اس میں
ہمیشہ رہیں گے۔"

اللہ تعالیٰ اپنا تعارف یوں کراتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ○ ﴿انعام:۹۶﴾

"بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے۔ زندہ کو
مردے سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہ
ہے اللہ۔ تم کہاں اوندھے جاتے ہو۔"

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ ﴿الروم:۱۹﴾

"وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا
ہے اور زمین کو جلاتا ہے اُس کے مرنے کے بعد۔"

كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴿الانعام:۱۴۲﴾

"کھاؤ اس سے جو اللہ نے تمہیں رزق دیا اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو' بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔"

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴿الاعراف:۲۷﴾

"(فرمایا) اے آدم کی اولاد! خبردار!! شیطان تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کرلے جیسا اس نے تمہارے ماں باپ کو بہشت سے نکالا۔ اتروادیئے ان کے لباس تا کہ ان کی شرم کی چیزیں ان کی نظر پڑیں۔ بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں' جہاں سے تم نہیں دیکھتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان کا دوست کیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ ﴿بنی اسرائیل:۵۳﴾

"کہہ دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ بات کہیں جو اچھی ہے۔ بے شک شیطان عداوت پھیلاتا ہے ان کے درمیان۔ بلاشک

شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴿البقرۃ:۲۵۱﴾

"اگر نہ دفع کرتا اللہ بعض لوگوں کو بعض سے تو یقیناً فساد پھیل جاتا زمین پر۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔"

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ ﴿الحج:۴۰﴾

"اور اگر نہ دور کرتا اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے تو ڈھائے جاتے درویشوں کے خلوت خانے' نصاریٰ کے عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ اور بے شک اللہ مدد دیتا ہے اس کو جو اللہ کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ قوی اور عزیز ہے۔"

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿یوسف﴾ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ ﴿فاطر:٦﴾

"تحقیق شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ تحقیق شیطان تمہارا

دشمن ہے پس اسے دشمن ہی سمجھو بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ
اپنی جماعت کو پکارتا ہے تا کہ وہ ہو جائیں دوزخ میں رہنے
والوں میں سے۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○ ﴿الفرقان:۳۱﴾

"اور اسی طرح ہم نے بنا دیا ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے
ایک دشمن اور کافی ہے آپ ﷺ کا رب ہدایت کرنے والا اور
مددگار۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ ﴿الانعام:۱۱۲﴾

"اور اسی طرح ہر ایک نبی کے لئے ہم نے بنا دیئے شیطان
دشمن جنوں اور آدمیوں میں سے جن میں سے بعض بعض کے
دلوں میں بنائی ہوئی بات ڈالتے ہیں فریب دینے کے لئے۔ اگر
آپ ﷺ کا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ دیجئے
انہیں اور اس فریب کو جو وہ باندھتے ہیں۔"

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَ

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ O ﴿ھود:۱۱۸'۱۱۹﴾

"اور اگر آپ ﷺ کا رب چاہتا تو ضرور کر دیتا سب لوگوں کو
ایک اُمت وہ ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر رحم
کیا تیرے رب نے۔ اور اسی لئے پیدا کیا ہے اُن کو۔ اور پوری
ہوئی تیرے رب کی بات البتہ بھروں گا میں دوزخ کو سب جنوں
اور آدمیوں سے۔"

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ وہ کائناتی قانون جو اس کائنات کی ساخت میں رکھا گیا ہے مزاحمت اور مزاحمت کی مزاحمت کا قانون ہے جو نشوونما کے عمل کو متعین کرتا ہے۔

ہر چند کہ وہ بنیادی (مابعد الطبیعیاتی) اخلاقی قانون بھی جو فاعل اخلاق کی سعادت و شقاوت کو متعین کرتا ہے فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے' یوں واضح کیا گیا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا O ﴿الشمس:۸﴾

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا O ﴿الشمس:۹﴾

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا O ﴿الشمس:۱۰﴾

"وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو حرص و لالچ سے پاک کیا اور وہ تباہ ہو گیا جس نے اسے مٹی میں ملایا۔"

یہی ناقابل شکست قانون ہے جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور اسی قانون کی حقانیت کو پانے اور اسی قانون کی تعمیل سے ایک فرد اپنے آپ کو صراط مستقیم پر

چلا سکتا ہے لیکن اخلاقی انضباط اور اخلاقی جدوجہد میں استقامت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس اخلاقی قانون پر عمل پیرا ہونے کے لئے تاریخی قانون کے ذریعہ استقامت مہیا کی جائے جسے یوں تشکیل کیا جا سکتا ہے:

"دو گروہ جن کے دو متضاد مقاصد ہوں۔ اُن کے پیچھے دو وفاداریاں ہوں۔ ان کے پیچھے دو متضاد منظم ارادے ہوں۔ ان ارادوں کے درمیان تصادم ہو۔ اس تصادم کو کامیاب بنانے کے لئے دو پروگرام ہوں۔ ان دو گروہوں میں سے ایک کو قرآن حزب اللہ کہتا ہے اور دوسرے کو حزب الشیطان۔ ایک کو اہل "الجنتہ" کہتا ہے اور دوسرے کو "اہل النار۔" ایک کو اصحاب یمین کہتا ہے اور دوسرے کو اصحاب شمال۔ ایک کو اصحاب میمنہ کہتا ہے اور دوسرے کو اصحاب مشئمہ۔ ایک کو خیرالبریہ کہتا ہے اور دوسرے کو شرالبریہ۔

یہی وہ قانون ہے جس سے تاریخی عمل کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس قانون کی خصوصیت قرآن مجید ان آیات میں واضح کرتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿الفتح: ۲۳﴾

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿احزاب: ۶۲﴾

اور نہیں تبدیل ہوتی سنت اللہ۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ﴿فاطر: ۴۳﴾

"اور نہیں تحویل ہوتی اللہ کی سنت۔"

تاریخ کا قانونِ تضاد

وہ قانونِ تضاد جس سے تاریخی جدوجہد کے نتائج متعین ہوتے ہیں' جس کی نشاندہی قرآن مجید میں کی گئی ہے' یہ ہے کہ:

"دو گروہوں میں ایک حزب اللہ اور دوسرا حزب الشیطان۔"

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴿المجادلہ:۲۲﴾

"تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور آخرت کے دن پر کہ دوستی کریں اُن سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مخالفت کی۔ اگرچہ وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔ یہی ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرما دیا اور اپنی طرف کی رُوح سے ان کی مدد کی اور انہیں باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہیں۔ ان میں ہمیشہ رہیں۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ اللہ کی جماعت ہے۔ سنتا ہے' اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ
وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ
لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا
اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ لَنْ
تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا
فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ
ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ۝ (المجادلہ: ۱۴۔۱۹)

"کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جو ایسوں کے دوست ہوئے جن پر اللہ کا غضب ہے۔ وہ نہ تم میں سے ہیں نہ ان میں سے۔ وہ دانستہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بے شک وہ بہت ہی برے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ پھر اللہ کی راہ سے روکا تو ان کے لئے خواری کا عذاب ہے۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے سامنے انہیں کچھ کام نہ دیں گے۔ وہ دوزخی ہیں۔ انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔ جس دن اللہ ان

سب کو اٹھائے گا تو اس کے حضور بھی ایسے ہی قسمیں کھائیں
گے جیسی تمہارے سامنے کھا رہے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان
کی قسمیں کار آمد ہیں۔ سنتے ہو بے شک وہی جھوٹے ہیں۔ ان
پر شیطان غالب آگیا تو انہوں نے اللہ کی یاد بھلا دی۔ وہ شیطان
کے گروہ ہیں۔ سنتا ہے بے شک شیطان کا ہی گروہ ہار میں
ہے۔"

حزب اللہ' اصحاب الیمین' اصحاب المیمنہ' اصحاب الجنہ ہیں۔ اور حزب الشیطان اصحاب الشمال' اصحاب المشئمہ' اصحاب النار و اصحاب الجحیم ہیں۔

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۝ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۝ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝

﴿الواقعہ: ۲۷ تا ۳۴﴾

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۝ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۝ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ ﴿الواقعہ: ۴۱ تا ۵۰﴾

"اور دہنی طرف والے۔ کیسے دہنی طرف والے۔ بے کانٹے کی بیریوں میں اور کیلے کے گچھوں میں اور ہمیشہ کے سائے میں اور ہمیشہ جاری پانی میں اور بہت سے میووں میں جو نہ ختم ہوں اور نہ روکے جائیں اور بلند بچھونوں میں (ہوں گے۔)

اور بائیں طرف والے۔ کیسے بائیں طرف والے۔ جلتی ہوا میں اور کھولتے پانی میں اور جلتے دھوئیں کی چھاؤں میں۔ جو نہ ٹھنڈی نہ عزت کی۔ بے شک وہ اس سے پہلے نعمتوں میں تھے۔ اور اس بڑے گناہ کی ہٹ رکھتے تھے اور کہتے تھے کیا جب ہم مرجائیں گے اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم ضرور اٹھائے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی۔ تم ﷺ فرماؤ بے شک سب اگلے پچھلے ضرور اکٹھے کئے جائیں گے ایک مقررہ دن۔"

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ○ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ○ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ○ ﴿البلد: ۱۲ تا ۲۰﴾

"اور آپ ﷺ نے کیا جانا وہ گھاٹی کیا ہے۔ کسی بندے کی

گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا دینا رشتہ دار یتیم کو یا خاک
نشیں مسکین کو۔ پھر (یہ) ہو اُن سے جو ایمان لائے اور انہوں
نے آپس میں صبر کی وصیتیں کیں اور آپس میں مہربانی کی
وصیتیں کیں۔ یہی دہنی طرف والے ہیں اور جنہوں نے ہماری
آیتوں سے کفر کیا وہ بائیں طرف والے۔ ان پر آگ ہے اس
میں ڈال کر اوپر سے بند کر دی گئی ہے۔"

ان دونوں گروہوں کے دو متضاد مقاصد ہوتے ہیں۔ اصحاب المیمنہ کا نفع بخشی کا اور اصحاب المشئمہ کا مزعومہ مفاد کو محفوظ رکھنے کا۔ اور ان کی دو وفاداریاں ہوتی ہیں۔ حزب اللہ کی وفاداری پیغمبر اور اس کے ساتھیوں سے' اور حزب الشیطان کی وفاداری پیغمبر کے "دشمنوں" سے۔ ان کے پیچھے دو منظم ارادے ہوتے ہیں اپنے اپنے غلبے کے لئے۔ اور ان دونوں کے دو پروگرام ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان تصادم ہوتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ

﴿الانبیاء:۱۸﴾

"بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں۔ پھر وہ اس کا بھیجہ
نکال دیتا ہے۔ پھر وہ مٹ کر رہ جاتا ہے۔"

یہ تصادم حق کے غلبے اور باطل کی شکست پر منتج ہوتا ہے:

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ ﴿شوریٰ:۲۴﴾

"اللہ مٹاتا ہے باطل کو' ثابت کرتا ہے حق کو اپنی باتوں سے۔"

عروج و زوال کی حرکت مستدیر' جس کی وضاحت نقشے میں کی گئی ہے' اُس میں زوال کے جس مرحلے سے بھی ولولہ انگیز مقصد کا شعور پیدا ہو جائے اور منظم جدوجہد شروع کر دی جائے' وہیں سے عروج شروع ہو جاتا ہے۔ زوال کا مکمل ہونا لازم نہیں۔

تاریخ میں تضاد کا یہ قانون دراصل اس قانون تضاد کا مظہر ہے جو تکوین میں مضمر ہے۔ جسے کائناتی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس کی وجہ سے کائنات کی ساخت انسانی جدوجہد میں کامیابی کے ساتھ سازگار ہے جو قانون تضاد تکوین و تخلیق میں مضمر ہے وہی مزاحمت اور مزاحمت کی مزاحمت کا موجب ہوتا ہے اور یہ تضاد ہی کا قانون ہے جو انتہائی شدید جدوجہد کو استقامت اور استمرار بخشتا ہے جس کی بدولت ناسازگار حالات پر غلبہ پانے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے جس کی شہادت کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر غور کرکے اس کائناتی قانون تضاد کا تعلق ایک طرف تاریخی قانون تضاد سے اور دوسری طرف اخلاقی قانون سے سمجھنا درکار ہے۔ اخلاقی کمال حاصل کرنے کے لئے جو جدوجہد ضروری ہے اس میں استقامت اُن شدائد سے پیدا ہوتی ہے جو کسی جماعت کے افراد کو غایت معلومہ کے حاصل کرنے میں پیش آتے ہیں۔ جن کی بدولت اخلاقی سیرت میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور دو متضاد قوتوں میں سے غلبہ اُسی کو حاصل ہوتا ہے جس میں نفع بخشی کی ضمانت ہو۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ق صلے اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝ ﴿الانبیاء:۱۶تا۱۸﴾

"اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے عبث نہیں بنائے۔ اگر ہم کوئی بہلاوا اختیار کرنا چاہتے تو اپنے پاس سے اختیار کرتے۔ اگر ہمیں کرنا ہوتا بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے تو وہ جب ہی مٹ کر رہ جاتا ہے اور تمہاری خرابی ہے اُن باتوں میں جو خود بناتے ہو۔"

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ ﴿الرعد:۱۷﴾

"اس نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے اپنے اپنے لائق بہ نکلے۔ پھر پانی کی رو اس پر اُبھرے ہوئے جھاگ اٹھالائی اور جس پر آگ دہکاتے ہیں گہنا یا اور اسباب بنانے کو اس سے بھی ویسے ہی جھاگ اٹھتے ہیں۔ اللہ بتاتا ہے کہ حق اور باطل کی یہی مثال ہے تو جھاگ تو پھک کر دور ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کے کام آئے زمین میں رہتا ہے۔"

تاریخ قوموں اور تہذیبوں کے احیاء و تجدید کا عمل پہلے ہے اور زوال و عروج کا علم بعد میں اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ:

عروج کیا ہے؟

غایت کا تصور اس کے حصول کے لئے تنظیم کی احتیاج کا شعور' حصول غایت کا یقین' اس کے حصول کا لائحہ عمل اور حصول غایت کی جدوجہد میں استقامت عروج ہے۔

کسی تہذیب اور اس کی حامل قوم کے عروج کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد یا گروہ کی تخلیقی جدوجہد میں تعطل کو روا نہ رکھا جائے۔ اس کی معیشت کامل ہو' یعنی مختلف طریقوں سے معاشی تخلیق کی جدوجہد کرنے والے پہلے ایک دوسرے کی احتیاج پوری کرتے ہیں۔ اور صرف زائد از ضرورت خام مال یا صنعتی اجناس برآمد کرتے ہوں معاشی اعتبار سے خود کفیل ہوں اور بین الاقوامی سطح پر معاشی اعتبار سے ایک باوقار حیثیت رکھتے ہوں۔ زندگی کے ہر پہلو میں معیاری قیادت میسر ہو۔ قومی غایت اور ثقافتی فضائل کی پوری بصیرت اُن قائدین کو حاصل ہو اور اُن کی قیادت زندگی کے کسی پہلو میں اپنا بدل پیدا کرنے کی ذمہ داری سے غافل نہ ہو۔ سیاسی طور پر خوب منظم ہوں۔ عمرانی نظام کی حیثیت سے ان میں کامل ضبط و انقیاد پایا جاتا ہو۔ تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوں اور سب اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والوں کے لئے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہونے کی راہیں کھلی ہوں۔ زندگی کے کسی میدان میں قحط الرجال سے دوچار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

جس عمل سے عروج ہوتا ہے اس کے مدارج یہ ہیں کہ مقصد کا شعور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے حصول میں جو مشکلات ہیں ان کے اندازے سے رجوع الی اللہ کا تقاضا ابھرتا ہے اور اللہ کی مدد کو پانے کے لئے اپنے اندر ضبط و انقیاد پیدا کرنا لازم آتا ہے۔ اخلاق صالحہ پیدا ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف کا احساس ایثار پر مائل کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں حق شناسی پیدا ہوتی ہے اور عمرانی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وفاداری اور باہمی عدل ضروری ہو جاتا ہے۔ بے غرضی' سخت

کوشی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نتیجہ میں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ غلبہ حق کے بعد قانون کا اقتدار اور اقتدار کا استحکام لازم آتا ہے اور جب حاکم کا اقتدار مقصد بننے لگتا ہے زوال کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سیاسی تنظیم کا مطلب یہ ہے حاکم اور محکوم وجود میں آگئے اور تنظیم سے حاکم کو محکوم سے اطاعت کا مطالبہ کرنے کا حق پیدا ہوتا ہے۔ یہ مطالبہ ہوسِ اقتدار کی خاطر کیا جائے تو سیاسی تناقض پیدا ہو کر رہتا ہے۔

تناقض کے رفع ہونے کی شرط یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی وجود میں آئے جس کے مطاع اور مطیع دونوں پر منزل من اللہ احکام واجب التعمیل ہوں اور اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں معاہدۂ عمرانی ہی کے قیام کا حکم ہے۔ اس حکم کی تعمیل کے بغیر سیاسی تنظیم سے اسلامی ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔

اور محکوم کے مفاد کی خاطر اطاعت کا مطالبہ کیا جائے تو سیاسی تناقض رفع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل اور اس میں خلوص ایک محرک کا طلب گار ہے۔ یہ محرک تضاد سے میسر آتا ہے۔ حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی قانونی تضاد سے متعین ہوتی ہے یہی قانون تضاد تاریخی حرکت کے نتائج بروئے کار لاتا ہے۔(ا)

(ا) یہی قانون تضاد لائحہ عمل کی اساس ہے۔ حصول مقصد کی جدوجہد کے پہلے قدم یعنی تلاوت آیات ہی سے تضاد شروع ہو جاتا ہے۔ غلبہ حاصل ہونے کے بعد دب جاتا ہے۔ تضاد کی شدت میں کمی جہاد سے غافل ہونے سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجہ میں صلابت کردار' استحکام سیرت اور حرارت ایمانی میں کمی کی ابتدا ہو جاتی ہے جس کا تدارک انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کے لائحہ عمل سے ہو سکتا ہے۔

اور ذہن اس امتیاز سے عاری ہو جائے کہ انسانی سطح پر شرط حیات کیا ہے اور حیوانی سطح پر شرط زندگی کیا ہے اور لاشعوری طور پر ذہن اپنے ماحول کو اپنے نصب العین سے سازگار بنانے کے بجائے حیوانوں کی طرح اپنے آپ کو ماحول سے سازگار بناتے ہوئے حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے لئے قانع ہو جائے۔

زوال کیسے ہوتا ہے؟

مزعومہ مفاد غالب آنے لگے اور "قانون کے غلبے" کے بجائے حاکم کا غلبہ اس کا مقصود بن جائے تو "عزیمت" کے بجائے "رخصت" پر عمل کرنا شعار بن جاتا ہے رفتہ رفتہ بالادست طبقے کا ذہن نشاط کاری کی طرف مائل ہوتا ہے' اخلاق رذیلہ کا میلان پیدا ہوتا ہے اور لذت اندوزی کے باعث زندگی ہوس انگیزی اور معصیت کوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ معصیت کوشی اور ہوس انگیزی کے تقاضے ذاتی الطبع اور رذیل لوگوں کے تعاون سے پورے ہونے لگتے ہیں اس لئے "سفلہ نوازی" مستحق نوازی کی جگہ لے لیتی ہے۔ غیرعادلانہ معیشت رواج پاتی ہے اور نظم وضبط کو تشدد سے قائم کرنا لازم آتا ہے۔ بعض لوگوں کے حق میں نا روا نرمی اور بعض لوگوں کے حق میں ناروا سختی سے حکومت کا نظام استبداد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بے انقیادی اور لاقانونیت کا راستہ کھل جاتا ہے اور قوم محکومی اور حاجت مندی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ

وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ ﴿الجاثیہ:۵﴾

تتمہ

علم بالوحی ماہیت کا نہیں' "غایت اور اس کے حصول کے ضامن لائحہ عمل" کا علم ہے۔ اس کا موضوع "کتب" ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴿البقرۃ:۱'۲﴾

"کتب" کا سرچشمہ وحی ہے۔ علم بالوحی کا مسئلہ یہ ہے کہ "اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت کو پانا چاہیں (جس کے لئے سورۃ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ المستقیم کی دعا کی جارہی ہے جس میں ماضی' حال اور مستقبل کے تمام مسلمان مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہ کے ساتھ شریک ہیں) تو

⇦ ہماری غایت کیا ہو؟

⇦ ہمارا تصورِ کائنات کیا ہو؟

⇦ ہمارا زاویہ نگاہ کیا ہو؟

⇦ ہمارا لائحہ عمل کیا ہو؟

⇦ ہمارا معیار کیا ہو؟

⇦ ہمارا نمونہ کمال کیا ہو' اور

⇦ ہمارا محرک عمل کیا ہو؟ جو

⇦ عالمگیر ہو

⇦ مثبت ہو

⇦ عملی ہو

- قابل عمل ہو
- ولولہ انگیز ہو' اور
- حتماً' قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہو۔

اس مسئلے کے حل کے منہاج کا بنیادی اصول یہ ہے کہ:

- محمد رسول اللہ ﷺ پیغمبر انقلاب ہیں۔
- جن کی آرزوئے انقلاب مقدم ہے اور
- نزول قرآن موخر ہے اور قرآن صحیفہ انقلاب ہے اور
- منہاج کے جزوِ دوم یعنی مسئلے کے حل کے عمل
- تمیز' تعین' تضمن اور تعرف حدود صحت شامل ہیں۔

علم بالوحی کو انسانی علم سے (جس میں ماہیت کی ایک اعتبار سے ناکام اور دوسرے اعتبار سے ناتمام جستجو ہے) متمیز کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر امتیازات کو نظرانداز کر دینے کا اثر یہ ہے کہ:

علم بالوحی بصورت ہدایت تخلیق نتائج کا وظیفہ ادا کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔

جس کی شہادت یہ ہے کہ اس امتیاز سے صرف نظر ہو جانے کے بعد سے جب بھی ہم زوال سے نکلنے کے لئے قرآن مجید سے رہنمائی طلب کرنے کی خاطر قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو آرزو تو غلبہ حق کی پیدا ہوتی ہے مگر مشاہدہ غلبہ باطل کا ہوتا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ ہم اور زیادہ مایوسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دورِ نبوت میں از بعثت تا حجتہ الوداع کتاب و سنت ہی کی پیروی سے تمام نتائج

کا حیات ارضی ہی میں بروئے کار آجانا تجربی توثیق و شہادت سے ثابت ہو گیا۔

چونکہ قرآن مجید ابدی ہدایت ہے اور خاتم الوحی ہے اس لئے امت کے زوال پذیر ہو جانے کی صورت میں ہدایت کی نتیجہ خیزی کے اعتبار سے "حجتہ من بعد الرسل" ہے۔ جس کی ہدایت کے حتماً' قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت حکمت قرآنی (تصورِ کائنات) اور اس میں مضمر کائناتی قوانین (قانون نشوونما' تاریخی قانون تضاد اور قانون سعادت و شقاوت) اور اللہ تعالیٰ کے اپنی الوہیت کے ان دعووں میں مضمر ہے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ○

﴿یوسف:۲۱﴾

اور خدا اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ط اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ○

﴿المجادلہ:۲۱﴾

خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔ بے شک خدا زور آور اور زبردست ہے۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ○ ﴿المائدۃ:۵۶﴾

خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ط اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ○

﴿المجادلہ:۲۱﴾

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ج ﴿النور:۵۷﴾

ایسا خیال نہ کرنا کہ کافر لوگ ہم کو زمین میں عاجز کردیں گے۔

تو

پھر نتیجہ خیزی کی ضمانت کے لئے اور کیا چیز ضروری ہے!!!

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ ۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ○ ﴿الجاثیہ:۶﴾

تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس چیز پر ایمان لائیں گے۔